علّامہ اقبال

(مصلح قرن آخر)

ڈاکٹر علی شریعتی

مُترجم

کبیر احمد جائسی

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی۔ سری نگر ۶

علامہ اقبال

(مصلح قرن آخر)

علّامہ اقبال

(مصلح قرن آخر)

ڈاکٹر علی شریعتی

مُترجم

کبیر احمد جائسی

اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی۔ سری نگر

© اُردو ترجمہ: کبیر احمد جائسی

Allama Iqbal

Dr. Ali Shariati

Translated by Kabir Ahmed Jaisi

تقسیم کار:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر، نئی دہلی 110025، اُردو بازار، دہلی 110006

پرنسس بلڈنگ، بمبئی 400003، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202001

بار اوّل　تعداد 500　فروری ۱۹۸۲ء　قیمت =/12

برٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی 110002 میں طبع ہوئی۔

فہرست

پیش لفظ	پروفیسر آل احمد سرور	۹
مقدمہ	کبیر احمد جائسی	۱۳
اقبال مصلح قرن آخر	ڈاکٹر علی شریعتی	۳۱

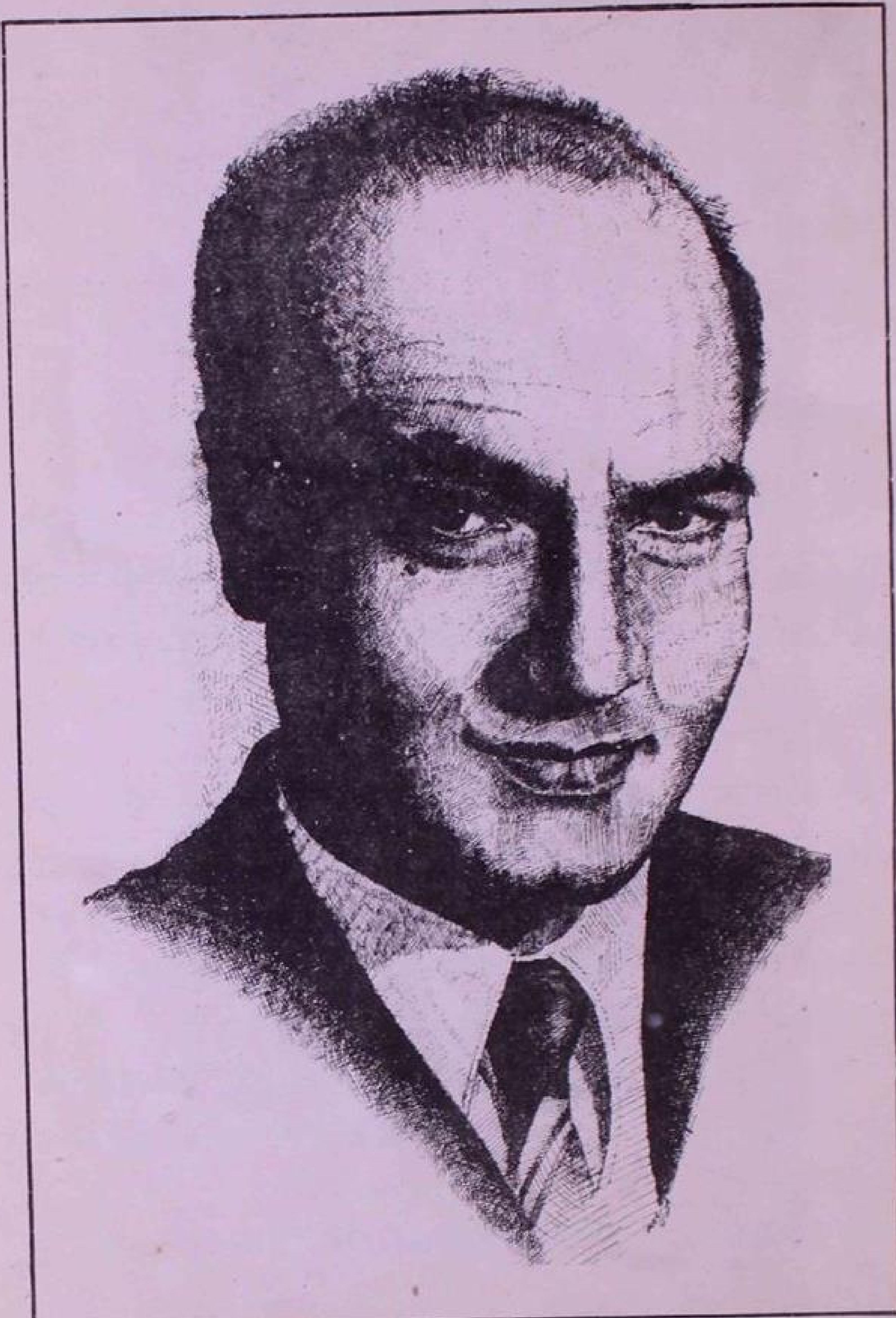

ڈاکٹر علی شریعتی

پیش لفظ

غالباً ۱۹۴۳ء کی بات ہے کہ ایران سے ایک ثقافتی وفد ہندستان آیا جس کے قائد ڈاکٹر علی اصغر حکمت اور ایک رکن ابراہیم پورداؤد تھے۔ پورداؤد شانتی نکیتن میں چند سال قیام کر چکے تھے اور ٹیگور سے متاثر اور ذاتی طور پر واقف تھے۔ وہ دانشگاہِ تہران میں زبان و فرہنگ ایرانِ باستان کے استاد تھے۔ ان کا یہ مصرعہ بہت مشہور ہے ؎

جوانِ پارسی ایران پرستد

لاہور میں اس وفد سے دریافت کیا گیا کہ اقبال کے متعلق آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟ اس پر پورداؤد نے جواب دیا "اقبال یک شاعرِ محلی بودہ است، در ایران کسی او را نمی شناسد" اقبال اور ٹیگور کا موازنہ کرتے ہوئے انھوں نے ٹیگور کو آفاقی شاعر اور اقبال کو مقامی شاعر قرار دیا۔ اس پر وہاں کے اخباروں میں خاصی لے دے ہوئی تو علی اصغر حکمت نے اس طرح بات ختم کی کہ یہ پورداؤد کی ذاتی رائے ہے، وہ خود اقبال کی عظمت کے قائل ہیں۔

بہرحال واقعہ یہ ہے کہ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں ایران میں قوم پرستی کا میلان بڑی ترقی پر تھا، محمد حسین مشایخ فریدنی نے اسرارِ خودی و رموزِ بےخودی کے بنیادِ فرہنگِ ایران کے ایڈیشن کے آغاز میں لکھا ہے کہ:

"از رجال و فضلای ایرانی تنہا آقای عباس آرام را می شناسیم کہ با مرحوم اقبال دوست و معاشر بودہ است"

سعید نفیسی اور اقبال سے خط و کتابت بھی ہوئی تھی۔ اقبال کا ایک فارسی خط بھی ان کے نام

ملتا ہے۔

محمد حسین مشایخ فریدنی نے لکھا ہے کہ چوتھی دہائی کے آغاز میں، ایرانی، گاندھی، نہرو، جناح اور ابوالکلام آزاد کے ناموں سے آشنا ہوئے۔ اس زمانے میں بعض خواص اقبال اور ان کے مرتبے سے بھی آگاہ ہونے لگے۔ مرحوم بہار نے یہاں تک کہا:

بیدلی گر رفت اقبالی رسید + اہل دل را نوبت حالی رسید
عصر حاضر خاصۂ اقبال گشت + واحدی کز صد ہزاران برگزشت
شاعران گشتند جیشی تار و مار + وین مبارز کرد کارِ صد سوار

اس کے بعد سعید نفیسی اور علی اصغر حکمت کے علاوہ مجتبیٰ مینوی، محیط طباطبائی نے اقبال کا تعارف کرایا لیکن یہ سلسلہ پاکستان کے قیام کے بعد اور تیز ہوگیا اور سید حسن تقی زادہ، سید ضیاء الدین طباطبائی، علی اکبر دھخدا، سمیعی، حسین علا، ڈاکٹر صورتگر، ڈاکٹر معین، محمد حجازی، رہی معیری، صادق سرمد، ناظر زادہ کرمانی، احمد علی رجائی، ڈاکٹر شریعتی، احمد سروش، ڈاکٹر رسا، ذبیح اللہ صفا، ڈاکٹر حسین خطیبی، حبیب یغمائی، ڈاکٹر علی صدارت، ادیب برومند، کاظم رجوی، ڈاکٹر مقتدری، گلچین معانی، ڈاکٹر محمد جعفر محجوب، سید غلام رضا سعیدی اور ڈاکٹر یوسفی نے اقبال کے تعارف اور تشریح کو عام کیا۔ ادبی رسالے یغما نے اس سلسلے میں نمایاں کام کیا۔

شروع میں ایرانی سبک ہندی کو زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے، اہل زبان میں یہ رویہ نیا نہیں ہے مگر بالآخر برصغیر میں فارسی شاعری اور فارسی زبان و ادب کے سلسلے میں جو کچھ ہوا ہے اس کا اعتراف ہونے لگا۔ اقبال کی شاعری کے عرفان سے زیادہ ان کے افکار نے ایرانیوں کے ایک حلقے کو متاثر کیا۔ اس حلقے میں ڈاکٹر علی شریعتی کا نام سرفہرست رکھا جا سکتا ہے۔ اقبال کے فارسی کلام کا ایک ایڈیشن "کلیاتِ اشعارِ فارسی مولانا اقبال لاہوری" کے نام سے تہران سے چھپا۔ اس کے علاوہ محمد حسین مشایخ فریدنی نے اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی کا ایک نہایت قابل قدر ایڈیشن شایع کیا جس میں ایک خاصہ مبسوط مقدمہ اقبال کے حالات، افکار اور شاعری پر ہے۔ اس کے علاوہ نہایت مفید حواشی بھی ہیں۔ بعض ایرانی اسکالروں سے معلوم ہوا کہ ۱۹۷۹ء کے انقلاب سے پہلے اقبال کے فارسی کلام کا ایک اور ایڈیشن تیار ہو رہا تھا۔ غالباً یہ ابھی منظر عام پر نہیں آسکا ہے۔

ان دانشوروں میں، جنہوں نے شاہ ایران اور پہلوی حکومت کے خلاف تحریک چلائی، علی شریعتی یقیناً بہت نمایاں ہیں۔ شریعتی نے بھی اقبال کی طرح اعلیٰ تعلیم یورپ میں پائی۔ اقبال نے انگلستان اور

جرمنی میں، شریعتی نے فرانس میں۔ ان کا فرانس کے بہت سے فلسفیوں اور دانش وروں سے رابطہ رہا۔ کبیر احمد جائسی کی اس رائے سے مجھے اتفاق ہے کہ علی شریعتی قرآن اور حدیث کے بعد اگر کسی چیز سے متاثر ہوئے تو وہ کلام اقبال ہے۔ علی شریعتی کی دو تقریریں انقلاب کے بعد ہندستان پہنچیں۔ ایک کا عنوان تھا' اقبال و ما اور دوسری کا اقبال مصلح قرن آخر۔ دوسری تقریر کا ترجمہ میری تحریک پر ڈاکٹر کبیر احمد جائسی نے کیا ہے جو اقبال انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شایع کیا جا رہا ہے۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کا ایک اہم پروگرام یہ ہے کہ اقبال کے تعارف اور تراجم اور اقبال شناسی کے سلسلے میں ہندستان اور پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں اور زبانوں میں جو کام ہوا ہے اس کا جائزہ لیا جائے تاکہ اقبال کی آفاقیت اور عالمی معنویت اور روشن ہو سکے۔ قدرتی طور پر فارسی میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا جائزہ لینا اور اس کی اہمیت کا تجزیہ کرنا سب سے زیادہ اہم تھا۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ ایران، افغانستان اور تاجیکستان پر سب سے پہلے توجہ کی جائے، لیکن چونکہ ڈاکٹر علی شریعتی اقبال سے بہت متاثر ہوئے اور ان کی فکر کی تشکیل میں اقبال کا اثر بہت اہم ہے اس لیے مناسب یہ معلوم ہوا کہ سب سے پہلے شریعتی کے اس مقالے کا ترجمہ اردو داں لوگوں کے لیے شایع کر دیا جائے۔ اس کے بعد فارسی میں پورے کام کا جائزہ لیا جائے گا۔

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی جو اس وقت اقبال انسٹی ٹیوٹ میں ریڈر ہیں، ہر طرح اس کام کے لیے موزوں تھے، انھوں نے نہ صرف فارسی ادب میں گہری نظر پیدا کر لی ہے بلکہ فارسی اور تاجیک ادب کے متعلق ان کی کئی تصانیف بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ ان کے یہاں علم کی لگن اور ادب کا وہ ذوق ہے جو انھیں فارسی کے استادوں اور اردو اور فارسی ادب پر تحقیق کرنے والوں میں ایک اہم درجہ دیتا ہے۔ وہ اردو کے ایک اچھے ادیب اور شاعر بھی ہیں اور ان کی ذہنی تربیت میں مولانا عبد السلام ندوی جیسے جید عالم کا ہاتھ رہا ہے، وہ میرے شاگرد رہے ہیں اور پرانے ساتھی اور رفیق ہیں اور میں انھیں ان کے خلوص، نظر اور ادبی ذوق اور انہماک علمی کی وجہ سے بہت عزیز رکھتا ہوں۔ میری تحریک پر وہ اقبال اور بیدل پر بھی ایک مونوگراف لکھ رہے ہیں اور امید ہے کہ وہ بھی ۱۹۸۲ء کے آخر تک شایع ہو سکے گا۔

اقبال کے ذریعہ سے زندگی، کائنات، انسانیت اور ادب کی جو معرفت حاصل ہو سکتی ہے اسے عام کرنا، اقبال انسٹی ٹیوٹ کا مشن ہے۔ یقین ہے کہ علی شریعتی کے اقبال کے متعلق یہ خیالات اس سلسلے میں مفید ہوں گے۔

سری نگر

۴ دسمبر ۱۹۸۱ء

(پروفیسر) آل احمد سرور

ڈائرکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ

مقدّمہ

۱۹۷۹ء میں ایران میں جو اسلامی انقلاب رونما ہوا اور جس طرح ایک ملک کے نہتے، مجبور اور بے بس عوام نے ایک مذہبی رہنما کی قیادت میں جاہ و جلال، دولت و حشمت، وحشت و بربریت اور ظلم و ستم کو شکست فاش دے کر محمد رضا شاہ پہلوی کو تخت و تاج چھوڑ کر ایران سے فرار ہونے پر مجبور کیا وہ صرف ایران ہی کی تاریخ میں نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ میں بھی ایک نئے عنوان اور ایک نئے باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر ہم دنیا کے انقلابوں پر نظر ڈالیں تو ہم کو صاف نظر آئے گا کہ دنیا میں جو اہم انقلابات آئے ہیں اور جنہوں نے قوموں اور ملکوں کی تاریخ کے رُخ کو ایک نیا موڑ دیا ہے، وہ کسی فرد واحد کی محنتوں کے ثمرہ نہ تھے بلکہ ان انقلابوں کے پس پشت بہت سے مخفی عوامل اور گم نام شہیدوں کا خون بھی کارفرما تھا۔ اس میں تو کوئی کلام نہیں کہ ایران کے اسلامی انقلاب کی رہنمائی کا فریضہ آیت اللہ خمینی نے انجام دیا ہے، لیکن اگر ایران کا ہر فرد و بشر "مرگ برشاہ" اور "درود بر خمینی" کا نعرہ نہ لگاتا، آیت اللہ خمینی کی دعوت پر لبیک نہ کہتا، مائیں اپنے بچوں، بہنیں اپنے بھائیوں اور بیویاں اپنے شوہروں کو اسلامی انقلاب کی راہ میں ہنسی خوشی قربان نہ کر دیتیں تو کیا یہ ممکن تھا کہ آیت اللہ خمینی کی تنہا کوششیں بار آور ہوتیں؟ اگر آیت اللہ خمینی کے افکار و نظریات پر لبیک کہتے ہوئے علماء کے علاوہ ایرانی دانش وروں کا بہت بڑا طبقہ آگے نہ بڑھتا اور ایران کے مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں آیت اللہ خمینی کے افکار و خیالات کی ترویج و اشاعت نہ کرتا تو کیا یہ ممکن تھا کہ جس نوجوان طبقے کو شاہ اور اس کی خفیہ پولیس، ساواک نے شراب اور جنس میں گلے گلے تک ڈبو دیا تھا، اسلامی انقلاب کا ہراول دستہ بنتا؟ علماء کے علاوہ دانش ور طبقہ کے جن افراد نے اسلامی انقلاب کی راہ ہموار کی اور اسی مقصد کے لیے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی ان میں سرفہرست مرحوم ڈاکٹر علی شریعتی کا نام آتا ہے۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر علی شریعتی قرآن و حدیث کے بعد اگر کسی چیز سے متاثر ہوئے تو وہ کلام اقبال اور صرف کلام اقبال ہے۔ آپ علی شریعتی کی کوئی کتاب اٹھا لیجیے

یا ان کا کوئی مقالہ پڑھیے آپ کو کہیں نہ کہیں ایسا ضرور محسوس ہوگا کہ کوئی شخص اقبال کے فارسی اشعار کو پرزور، مدلل اور مربوط فارسی نثر میں بیان کرتا چلا جارہا ہے اور بیان کرنے والے کو جو بھی ذہنی غذا حاصل ہو رہی ہے اس کا ماخذ و منبع کلام اقبال اور صرف کلام اقبال ہے۔

خوش قسمتی سے ڈاکٹر علی شریعتی کے وہ خیالات و افکار بھی محفوظ کر لیے گئے ہیں جو براہ راست علامہ اقبال کی ذات اور ان کے پیام سے تعلق رکھتے ہیں۔ تہران کے مشہور مدرسہ، حسینیہ ارشاد میں انھوں نے اقبال کے بارے میں دو تقریریں کی تھیں، ان میں سے ایک تقریر کا عنوان "اقبال و ما" تھا اور دوسری "اقبال مصلح قرن آخر" کے عنوان سے تھی۔ زیر نظر ترجمہ ڈاکٹر شریعتی کی اسی دوسری تقریر کا اردو ترجمہ ہے۔ جو قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

اب ہندستان میں ڈاکٹر علی شریعتی کا نام نامانوس تو نہیں ہے مگر اب بھی اردو خواں طبقہ کو ان کے مکمل حالات زندگی کا کوئی خاص علم نہیں ہے۔ اسی لیے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ذیل کے سطور میں ان کے حالات زندگی درج کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی مطبوعہ کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے مخصوص افکار و خیالات تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ علی شریعتی کی داستان حیات لکھتے وقت ان کی کتاب "کویر" کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس میں انھوں نے اپنے بزرگوں اور خاندان کے دوسرے افراد کا مفصل تذکرہ کرنے کے علاوہ خود اپنے بارے میں بھی بہت سے انکشافات کیے ہیں جن کی مدد سے علی شریعتی کی مختصر زندگی اور ان کے افکار و خیالات کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ ہم علی شریعتی کی داستان حیات قلم بند کرتے وقت "کویر" (نمک زار) کو بنیادی ماخذ کی حیثیت سے استعمال کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر علی شریعتی ۱۲ آذر ۱۳۱۲ھ ش (۲۳ نومبر ۱۹۳۳ء) میں خراسان کے ایک کوردہ اور دور افتادہ مقام مازینان کے ایک متقی، پرہیزگار اور فقہ جعفری کے حامی ایسے خانوادے میں پیدا ہوئے جس کے افراد مدتوں سے ملک کے بھٹکے ہوئے اور گم کردہ راہ افراد کو چراغ ہدایت دکھلا رہے تھے۔ ان کے خانوادے کی مذہبی اور علمی سیادت کا اندازہ علی شریعتی ہی کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے دادا آخوند حکیم نے تحریک مشروطیت کے شروع ہونے سے اسّی سال قبل کے معاشرے میں فلسفہ اور فقہ کی اعلا تعلیم حاصل کر کے اس میں اتنا کمال پیدا کر لیا تھا کہ ان کی شہرت کے ڈنکے تہران، مشہد، اصفہان، بخارا اور نجف کے علمی و مذہبی حلقے میں بھی بجنے لگے تھے، حالانکہ وہ مازینان سے متصل ایک دوسرے کوردہ بہمن آباد میں بود و باش اختیار کیے ہوئے تھے[1]، بالخصوص تہران میں ان کی علمیت و مذہبیت کا اعتراف

---

[1] کویر ص ۹

بطور خاص کیا جاتا تھا۔ شدہ شدہ ان کی یہ شہرت اُس زمانے کے بادشاہ ناصرالدین شاہ قاچار تک پہنچی اور ناصرالدین شاہ قاچار نے ان کو تہران بلاکر مدرسۂ سپہ سالار میں فلسفہ پڑھانے پر متعین کیا لیکن انھوں نے تہران میں بہت دنوں تک قیام نہیں کیا اور چند برسوں کے بعد اپنے وطن بہمن آباد واپس آگئے اور یہیں سے علم و اخلاق کی روشنی اپنے پورے ملک میں پھیلاتے رہے۔ علی شریعتی کے دادا کا اثر ان کے والد محمد تقی شریعتی پر بھی پڑا اور انھوں نے بھی اپنے والد ہی کی طرح مذہبی تعلیم حاصل کی لیکن علی شریعتی ہی کے الفاظ میں انھوں نے اپنی خاندانی روایت کو توڑتے ہوئے اپنی زادگاہ کی طرف مراجعت نہیں کی بلکہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد شہر میں ہی بس گئے اور مزید علم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایک مذہبی اور نیم سیاسی تحریک کا بھی آغاز کیا جس کا نام "جنبشِ نوین اسلامی" تھا۔ علی شریعتی نے "کویر" میں کھل کر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان کی جو کچھ بھی اسلام پسندی ہے وہ صرف ان کے والد ہی کی تربیت کا نتیجہ ہے۔[۱] آقا محمد تقی شریعتی ان سطور کے تحریر کے وقت تک بقیدِ حیات ہیں اور اپنے جوان و ہونہار بیٹے کی مفارقت کا صدمہ برداشت کرنے کے باوجود اپنے تبلیغی کاموں میں ہمہ وقت منہمک رہتے ہیں۔

علی شریعتی کی عمر جب سات برس کی ہوگئی تو ان کو مازینان ہی کے ایک مکتب میں داخل کر دیا گیا۔ اس مکتب سے نکل کر انھوں نے دو اسکولوں، "دبستانِ ابن یمین" اور "دبیرستان فردوسی" مشہد میں تعلیم حاصل کی۔ شریعتی کے بچپن میں مازینان ایک انتہائی پس ماندہ علاقہ تھا اور وہاں کے تمام رہنے والے نہ صرف زندگی کی آسائشوں سے محروم تھے بلکہ روزمرہ کی ضروریات کی چیزیں بھی ان کو کم ہی حاصل ہو پاتیں اور وہاں کے عوام کا ایک بڑا طبقہ تنگی ترشی کے ساتھ اپنی زندگی گزارا کرتا۔ علی شریعتی کو یہیں سے غریبوں سے ہمدردی پیدا ہوئی اور بچپن ہی کے زمانے سے ان کے دل میں باغیانہ خیالات پرورش پانے لگے۔ ۱۳۲۹ھ ش میں انھوں نے مشہد کے ٹیچرس کالج میں بیسک ٹیچنگ ٹریننگ کے دو سالہ کورس میں داخلہ لیا اور اس کورس کو مکمل کرنے کے بعد ۱۳۳۱ھ ش میں احمد آباد کے گاؤں میں جو مشہد کے اطراف میں واقع ہے معلم مقرر ہو گئے۔ علی شریعتی نے احمد آباد آکر بھی ذاتی مطالعے کی عادت برقرار رکھی اور اسی زمانے میں ان کی توجہ تصنیف و تالیف کی طرف مرکوز ہوئی۔ چنانچہ معلمی کا پیشہ اختیار کرنے کے بعد چار برسوں کے اندر اندر انھوں نے اپنی پہلی کتاب لکھی جو حضرت ابوذر غفاریؓ کے سوانح و کوائف زندگانی سے بحث کرتی ہے۔ اس موضوع کے انتخاب ہی سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علی شریعتی کا ذہن ان کے آغازِ شباب ہی

---

[۱] کویر ص ۱۹

سے کس نہج پر کام کرنے لگا تھا، انھوں نے اپنی اس کتاب میں حضرت ابوذر غفاریؓ کو "اولین خدا پرست سوشلسٹ" کے نام سے یاد کرتے ہوئے ان کے حالات زندگی بڑے ہی موثر انداز سے لکھے ہیں۔

علی شریعتی کے دل میں حصول علم کی جو تڑپ تھی اس نے انھیں نچلا نہ بیٹھنے دیا۔ انھوں نے اپنے دل میں ایک بار پھر طالب علم بننے کی ٹھانی، چنانچہ چار برسوں تک معلمی کا فریضہ انجام دینے کے بعد اس سے دست کش ہوئے اور ۱۳۳۲ھ ش میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے مشہد یونیورسٹی کی آرٹس فیکلٹی میں داخل ہو گئے۔ مشہد یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے ان کو ابھی ایک سال ہی کا عرصہ گذرا تھا کہ ان کو اپنی ایک ہم درس سے محبت ہو گئی اور کچھ ہی دنوں کے بعد انھوں نے اپنی اُس ہم درس سے شادی کرلی۔ ان خاتون کا نام ڈاکٹر پوران شریعت رضوی ہے جو ابھی بقید حیات ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آیت اللہ کاشانی اور سابق وزیر اعظم ایران ڈاکٹر مصدق تیل کی صنعت کو قومیا لینا چاہتے تھے، لیکن حالات نے مساعدت نہ کی اور امریکہ کے ایجنٹوں کے ذریعے رضا شاہ پہلوی اپنے کھوئے ہوئے وقار و اقتدار کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ڈاکٹر مصدق کو وزارت عظمیٰ کے عہدے سے دست کش ہونا پڑا۔ ڈاکٹر مصدق کے زوال کے بعد بھی آزادی کے متوالوں کے حوصلے پست نہیں ہوئے، اُسی زمانے میں آیت اللہ طالقانی، ڈاکٹر یداللہ سحابی اور مہدی بازرگان نے ایک قومی تحریک کی داغ بیل ڈالی جس میں علی شریعتی بھی شامل ہو گئے۔ ۱۳۳۶ھ ش میں شاہ کی حکومت نے اس تحریک پر قدغن لگانے کا عمل شروع کیا اور ایران بھر میں اس تحریک کے جتنے مرکز تھے سب کو اپنے ناگہانی حملوں کا ہدف بنا لیا۔ اس تحریک کے سرگرم کارکن چُن چُن کر گرفتار کیے جانے لگے۔ علی شریعتی اور ان کے والد آقا محمد تقی شریعتی دونوں اس تحریک کے انتہائی سرگرم کارکن تھے اس لیے ان دونوں حضرات کو گرفتار کر کے ایک فوجی ہوائی جہاز کے ذریعہ پہلے تو مشہد سے تہران لایا گیا پھر "قزل قلعہ" کے جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ آٹھ ماہ کی سخت قید و بند اور ایذا رسانی کے بعد ان کو رہا کیا گیا تو وہ پھر مشہد چلے آئے اور مشہد آکر انھوں نے پھر اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری کیا۔ ۱۳۳۶ھ ش میں انھوں نے فرسٹ ڈویژن میں اپنا یہ کورس پاس کر لیا۔

علی شریعتی اپنی اوائل عمری ہی سے لکھنے پڑھنے میں بہت تیز تھے۔ مشہد یونیورسٹی میں آکر ان کے ذہن و دماغ کو اور بھی جلا ملی اور ان کی ساری فطری صلاحیتیں ابھر کر سامنے آئیں جس کی وجہ سے ان کے تمام اساتذہ ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ جب علی شریعتی نے مشہد یونیورسٹی کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کر لیا تو ان کے بہی خواہ استادوں کی خواہش ہوئی کہ وہ ایران سے باہر جا کر مزید تعلیم حاصل کریں اور جب اپنی تعلیم مکمل کرلیں تو ایران واپس آکر ملک و ملت کی خدمت میں لگ جائیں۔ علی شریعتی کے اساتذہ کی کوششوں سے مشہد یونیورسٹی کے سینٹ نے ان کو وظیفہ دے کر ملک سے باہر تعلیم حاصل کرنے کا رزدلیوشن پاس کیا لیکن رضا شاہ کی بدنام

زمانہ خفیہ پولیس، ساواک کی رپورٹ علی شریعتی کے خلاف تھی اور ساواک کے سربراہ اعلیٰ کی خواہش یہ تھی کہ ان کو ملک سے باہر نہ جانے دیا جائے۔ اول اول تو ساواک کے ذمہ داروں کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی مگر ساواک کے کارپردازوں پر مختلف حلقوں کی طرف سے اتنا زور اور دباؤ پڑا کہ بالآخر علی شریعتی کو پاسپورٹ اور ویزا دے دیا گیا اور وہ ۱۳۳۹ھ ش میں تہران کو خیر باد کہہ کر مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے فرانس چلے گئے۔ وہاں جا کر انھوں نے جامعہ شناسی (سوشیالوجی) کے شعبہ میں داخلہ لیا۔ فرانس آ کر ان کو ایک آزاد فضا میں سانس لینے اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے تن دہی سے جد و جہد کرنے کا موقع ملا۔ وہ اپنے عملی کام کرنے کے ساتھ ساتھ علمی کاموں کے لیے بھی اچھا خاصہ وقت نکال لیتے۔ وہ جتنے دن بھی فرانس میں رہے ان کا قلم بڑی سرعت کے ساتھ چلتا رہا اور انھوں نے اس زمانے میں بہت سے انقلابی مقالے لکھے۔ نوشت و خواند کے علمی مشغلے کے ساتھ ساتھ ان کی عملی سرگرمیاں روز بروز بڑھنے لگیں اور وہ "سازمانِ انقلابی جوانانِ ملیِ ایران" کی یوروپی شاخ کے ایک سرگرم کارکن بن گئے۔ اس جماعت کی یوروپی شاخ کا ایک بڑا اجتماع مغربی جرمنی کے ایک شہر ویس بادن میں ہوا۔ اس اجتماع کے بعد طلبہ کی جماعت کی اس شاخ نے "ایران آزاد" کے نام سے ایک روزانہ اخبار نکالنا شروع کیا جس کے ایڈیٹر علی شریعتی تھے۔ یہ اخبار بہت دنوں تک تو نہ نکلا مگر جتنے دنوں بھی نکلا اتنے دنوں میں اس نے ایرانی طلبہ کے اندر ایک ایسی آگ بھڑکا دی جو ایران کے اسلامی انقلاب کے بعد ہی فرو ہو سکی۔ اسی زمانے میں علی شریعتی کا تعلق اس آزادی خواہ جماعت سے بھی ہوا جو "المجاہد" کے نام سے موسوم تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب الجزائر کے پس ماندہ، کمزور، ظلم و ستم سے کراہتے ہوئے نہتے عوام فرانس کے استحصال کے خلاف علم بغاوت بلند کیے ہوئے اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے تھے۔ علی شریعتی جیسا حریت پسند اس منظر کا خاموش تماشائی نہیں رہ سکتا تھا۔ انھوں نے الجزائر کے عوام سے کھل کر نہ صرف ہمدردی کا اظہار کیا بلکہ الجزائریوں کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہو کر فرانسیسی سامراج کو بے نقاب کرنے لگے۔ اسی زمانے میں وہ فرانٹز فینن، ہواری بومدین اور بن بلا سے آشنا ہوئے اور ان کے افکار و خیالات سے متاثر بھی۔ ان سب حضرات میں وہ فرانٹز فینن سے زیادہ متاثر تھے اور ان کے دوست بھی بن گئے تھے۔ یہ دوستی اس حد تک بڑھی کہ انھوں نے فرانٹز فینن کی ایک کتاب کا فارسی میں ترجمہ بھی کر ڈالا۔ جس کا نام انھوں نے "دوزخیان زمین" رکھا۔

فرانس کے دوران قیام میں علی شریعتی کو وہاں کے ادیبوں، دانش وروں اور ستم دیدگان سے حمایت کرنے والوں سے ملنے ملانے اور ان کے افکار و خیالات سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔

ان کے کچھ استاد بھی ایسے تھے جن سے وہ بطور خاص متاثر ہوئے اور یہ استاد بھی ان کی علمی لیاقت، محنت، لگن اور آزادی کی تڑپ کے بڑے معترف تھے، ایسے استادوں میں گورویچ، لوئی ماسینیوں کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں جو عمرانیات کے مشہور عالموں میں شمار ہوتے ہیں اس کے علاوہ شوارتز، سارتر، ہنری لوموزوژان کوکتو جیسے دانش وروں کے پاس بھی آتے جاتے رہے اور ان سے مختلف مسایل پر تبادلہ خیالات کرتے رہے لیکن ان سب حضرات میں وہ خاص طور سے گورویچ سے متاثر تھے ور ان کے علم کے نہ صرف قایل تھے بلکہ اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے خیالات و افکار کو ترتیب دینے کے بھی عادی بن گئے تھے۔

گذشتہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے کہ علی شریعتی کو الجزائریوں کی تحریک آزادی سے بھی قلبی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا، یہ لگاؤ اس حد تک بڑھا کہ وہ عملی طور پر الجزائریوں کی مدد کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس کی حکومت نے ان کو گرفتار کر لیا اور پیرس کے جیل خانے میں ڈال دیا مگر ان کے استادوں اور دوسرے دانش وروں کی کوششوں سے ان کو جلد ہی رہا کر دیا گیا اور وہ جیل سے باہر آکر پھر اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ فینن کے علاوہ علی شریعتی نے افریقی انقلابیوں کو بھی ایرانیوں سے روشناس کرایا انھوں نے مشہور افریقی انقلابی عمر اوزغان (صاحب افضل الجہاد) کے افکار و خیالات کو خاص طور سے اپنے پیش نظر رکھا اور ایرانیوں سے ان کا بھرپور تعارف بھی کرایا۔ علی شریعتی پانچ برسوں تک فرانس میں قیام پذیر رہے اور سار بون یونیورسٹی سے جامعہ شناسی (سوشیالوجی) میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اور اپنے وطن واپس آئے۔

سنہ ۱۳۴۳ھ ش (۱۹۶۴ء) میں انھوں نے ایران کی سرزمین پر قدم رکھا۔ اپنے فرانس کے قیام کے زمانے میں وہ برابر پہلوی حکومت کے خلاف علمی و عملی جد و جہد میں مصروف رہے تھے اس لیے ایران آتے ہی پہلوی حکومت نے ان کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ ان کے گرفتار ہونے پر فرانس کے دانش وروں، ادیبوں اور ان کے استادوں نے پہلوی حکومت سے خاص طور پر احتجاج کیا۔ یہ احتجاج اتنا بڑھا اور حکومت پر اتنا دباؤ پڑا کہ پہلوی حکومت نے مجبور ہو کر چھ ماہ کے بعد ان کو رہا کر دیا۔ اپنی رہائی کے بعد وہ مشہد کے مضافات میں واقع ایک مقام فردوس میں اسکول کے معلّم بنا کر بھیج دیے گئے۔ کچھ دنوں کے بعد سنہ ۱۳۴۴ھ ش میں اس مقام سے ان کو واپس بلا لیا گیا اور مشہد یونیورسٹی میں ان کا تقرر کر دیا گیا۔

مشہد یونیورسٹی میں آجانے کے بعد ان کے سامنے نوجوانوں کا ایک بہت بڑا گروہ تھا جن کی تربیت اگر وہ اپنے افکار و خیالات کے مطابق کر پاتے تو ایران کے انقلاب کی راہ بھی ہموار ہوتی اور ایسے افراد

بالخصوص نوجوانوں کی تعداد ایران میں بڑھ جاتی جو علوم جدیدہ سے تو پوری طرح واقف ہوتے مگر اسی کے ساتھ ساتھ اصل اسلامیت اور مشرقیت سے بھی بے بہرہ نہ ہوتے۔ اسی خیال کے پیش نظر انھوں نے انتہائی محنت، لگن، تن دہی اور انہماک کے ساتھ نئی نسل کی رہبری کا فریضہ اپنے ذمہ لیا۔ وہ اپنے کلاس میں درس دیتے وقت اس بات کا خاص طور سے خیال رکھتے کہ وہ جو کچھ بھی پڑھائیں اس کو اسلام کی کسوٹی پر بھی پرکھتے رہیں اور اپنے طلبہ کو یہ بتلاتے رہیں کہ وہ جن نظریات، افکار و خیالات کو پڑھا رہے ہیں ان میں سے کون کون سے افکار و خیالات ایسے ہیں جن کو ایک مسلمان کی حیثیت سے قبول کیا جا سکتا ہے اور کن کن نظریات، افکار و خیالات کو رد کر دینا چاہیے۔ علی شریعتی اپنے اسی انہماک، لگن اور اسلامی اقدار کی ترجمانی کی وجہ سے اپنے طلبہ میں مقبول ہوتے گئے، ان کی مقبولیت کا عالم یہ ہوا کہ دوسرے مضامین کے طلبہ بھی اجازت لے کر ان کے کلاس میں آتے اور ان کا لکچر سنتے۔ استاد کی حیثیت سے ان کی یہ مقبولیت ابھی تک مشہد تک ہی محدود تھی لیکن جب ان کے لکچروں کا شہرہ بڑھا تو دوسری یونیورسٹیوں کے طلبہ بھی اپنے اپنے جلسوں میں ان کو بلانے لگے اور وہ طلبہ کے ان جلسوں میں شریک ہو کر اپنے عمیق علم اور پرزور خطابت کے ذریعے ایک نئی زندگی اور نئی روح پھونکنے لگے۔

١٣٤٩ھ ش سے ان کا آنا جانا تہران کے مشہور دینی مدرسے حسینیہ ارشاد میں شروع ہوا، حسینیہ ارشاد کہنے کو تو ایک دینی مدرسہ تھا مگر اس کی بنیاد رکھنے والوں کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس مدرسہ کو ایران کے حریت پسندوں اور آزادی کی تڑپ رکھنے والوں کا مرکز بنا دیا جائے اور اس مدرسہ سے ایسے مسلمان طلبہ پیدا کیے جائیں جو ایک طرف اسلام کے تمام اصولوں سے نہ صرف واقف ہوں بلکہ ان پر سختی سے عامل بھی ہوں تو دوسری طرف یہی مسلمان طلبہ علوم حاضرہ پر بھی ماہرانہ نگاہ رکھتے ہوں اور عصر حاضر کے تقاضوں سے اس حد تک واقف و آگاہ ہوں کہ اپنے اجتہاد کے ذریعے گم کردہ راہ ایرانی قوم کو مشعل راہ دکھلا سکیں اسی کے ساتھ ساتھ وہ اس قابل بن سکیں کہ مطلق العنانیت کا سحر سامری توڑ کر اس سے باہر آ جائیں اور آزادی کی کھلی فضا میں سانس لیں۔ حسینیہ ارشاد کی بنیاد رکھنے والوں میں کئی علماء اور دانش ور شامل تھے جن میں آیت اللہ مطہری کا نام سر فہرست ہے۔ یونیورسٹیوں میں جب علی شریعتی کے لکچروں کا غلغلہ بلند ہوا تو حسینیہ ارشاد کے طلبہ نے بھی ان سے مستفید ہونا چاہا۔ اسی جذبے کے تحت حسینیہ ارشاد کے طلبہ ان کو تہران بلاتے رہے اور علی شریعتی بار بار حسینیہ ارشاد آ کر اپنی شعلہ بار تقریروں سے ان کے دلوں کو گرماتے رہے۔ زبانی روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علی شریعتی کے ان لکچروں میں صرف حسینیہ ارشاد کے طلبہ ہی شریک نہ ہوتے بلکہ تہران کے عوام، وکلاء، ڈاکٹر، اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ کی اتنی بڑی تعداد

شریک ہوتی کہ حسینیہ ارشاد میں ایک میلہ سا لگ جاتا۔ وہاں علی شریعتی جو بھی تقریر کرتے اس کو ٹیپ کر کرلیا جاتا اور دوسرے ہی دن اس کے کیسٹ ہزاروں کی تعداد میں بکنے لگتے جن کو خریدنے کے لیے لوگوں کی بھیڑ لگ جایا کرتی۔ حسینیہ ارشاد میں علی شریعتی نے جتنے بھی لکچر دیے وہ مختلف موضوعات پر مشتمل تھے۔ وہ عمرانیات کے علاوہ، تاریخ عالم، تاریخ اسلام، مذہب کا صحیح تصور، فلسفہ، تاریخ اور غرب زدگی کے موضوعات پر بھی لکچر دیا کرتے جو ان کے وسیع و عمیق مطالعے کے آئینہ دار ہوتے، علی شریعتی کی یہ مقبولیت شاہ کے حواریوں کے لیے خطرے کی گھنٹی سے کم نہ تھی۔ پہلے تو وہ ان لکچروں کو کسی نہ کسی طرح انگیز کرتے رہے مگر ۱۳۵۲ھ ش میں ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ شریعتی کی باغیانہ روش کو دبانے کے لیے شاہ کی خفیہ پولیس ساواک نے یہ فیصلہ کیا کہ حسینیہ ارشاد کو بند کر دیا جائے تاکہ وہاں پر کسی قسم کا کوئی اجتماع نہ ہو سکے۔ اس فیصلے کو عملی جامہ پہنایا گیا اور حسینیہ ارشاد بند کر دیا گیا، علی شریعتی کی کتابیں ضبط کرلی گئیں اور ان پر یہ پابندی لگا دی گئی کہ وہ کسی پبلک جلسے میں کوئی تقریر نہ کریں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ایران انقلاب کے دہانے پر کھڑا تھا اور انقلابی طاقتوں کو دبانے کے لیے ساواک نے ہر قسم کی وحشت، بربریت اور جنون کو روا سمجھ رکھا تھا، وقتی طور پر حسینیہ ارشاد بند ہوگیا، وہاں پر لوگوں کا اجتماع ختم ہوگیا مگر جن خیالات کا بیج علی شریعتی نے لوگوں کے دلوں میں بو دیا تھا وہ پروان چڑھتا رہا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ انقلابی قوتیں فاتح بنیں اور ان کو دبانے والے ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو گئے۔ ساواک کا عملہ علی شریعتی کو شاہ کا سب سے بڑا دشمن سمجھتا تھا حسینیہ ارشاد پر حملہ کرنے کے بعد انھوں نے علی شریعتی کو گرفتار کرنے کی اسکیم بنائی، لیکن بعض ذرائع سے علی شریعتی کو اس کی اطلاع مل گئی اور وہ روپوش ہو گئے، علی شریعتی کی روپوشی نے ساواک کو جھنجھلا کر رکھ دیا، ساواک نے انتقامی کارروائی کرتے ہوئے ان کے والد آقا محمد تقی شریعتی کو گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیا۔ آقا محمد تقی شریعتی کی گرفتاری کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس خبر کو سن کر علی شریعتی اپنے آپ کو ظاہر کر دیں گے۔ ساواک کی یہ توقع پوری ہوئی اور اپنی روپوشی کے دو ماہ گزار کر علی شریعتی ظاہر ہو گئے یہ ۱۳۵۲ھ ش کے مہر کا مہینہ تھا۔ ان کو فوراً گرفتار کرکے جیل خانہ میں ڈال دیا گیا جہاں وہ اٹھارہ مہینوں تک طرح طرح کے مظالم سہتے رہے۔

اس جبر و ظلم کو سہنے کا علی شریعتی کو اتنا صدمہ نہ تھا جتنا اس بات کا تھا کہ حسینیہ ارشاد کو بند کرکے ان سے ایک وسیع و عریض پلیٹ فارم چھین لیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں علی شریعتی کے دلی جذبات کا اظہار اس خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنی موت سے چند ہی دنوں پہلے اپنی اہلیہ ڈاکٹر پوران شریعت رضوی کو لندن سے لکھا تھا۔ انھوں نے لکھا کہ "جس طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے موذن حضرت بلال

شکنجے میں کسے ہونے کے باوجود جب بھی ہوش میں آتے تو صرف ایک ہی لفظ "احد" "احد" کہا کرتے، اسی طرح جب تک میری زندگی ہے، میری سانس برقرار ہے میں بھی جب جب ہوش میں آؤں گا تو صرف ایک ہی لفظ (حسینیہ) "ارشاد" "ارشاد" کے علاوہ اپنی زبان سے کوئی اور لفظ نہ ادا کروں گا"

اسی سلسلۂ سخن میں یہ بات بھی ذکر کردینے کے قابل ہے کہ علی شریعتی کی اہلیہ کا بیان ہے کہ یہ میاں بیوی جب بھی تنہائی اور فرصت کے لمحات پاتے تو علی شریعتی ان سے صحابیٔ رسولؐ حضرت ابوذرؓ کی باتیں کیا کرتے ان کی اہلیہ کا خیال ہے کہ جس جذبے نے ان کو 'علی شریعتی بنایا وہ جذبۂ ابوذری تھا جوان کے رگ وپے میں سرایت کرگیا تھا وہ خاص طور پر اُس وقت کو یاد کرتے جبکہ سزا کے طور پر حضرت ابوذرؓ کو ربذہ کے مقام پر بھیج دیا گیا تھا تاکہ ان کے افکار و خیالات سے دوسرے لوگ متاثر نہ ہوں۔ حضرت ابوذرؓ صرف کھجوروں اور مختلف درختوں کے پتوں پر اپنی زندگی گزارتے رہے مگر اس سختی، تنگی اور ترشی کے باوجود انھوں نے اپنے موقف سے سرمو انحراف نہ کیا، علی شریعتی کی سیرت کی تشکیل میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی سیرت کا کلیدی رول ہے اور ان کی شخصیت پر غور وفکر کرتے وقت اس حقیقت سے صرف نظر نہ کرنا چاہیے۔

ساواک نے گرفتار کرنے کو تو علی شریعتی کو گرفتار کرلیا مگر اس کا بڑا سخت ردِ عمل ہوا، ایران کے علاوہ دنیا میں جہاں جہاں ایرانی طلبہ کی انجمنیں تھیں ان سب نے ساواک کے اس عمل کے خلاف احتجاج کیا، الجزائر کے لوگ علی شریعتی سے براہ راست واقف تھے، اس لیے وہاں بھی ان کی گرفتاری پر بڑا سخت ردِ عمل ہوا اور مختلف افراد اور انجمنوں کی طرف سے شاہ کو احتجاجی تار بھیجے گئے کہ علی شریعتی کو رہا کردیا جائے۔ احتجاج اور ان تاروں کا تو حکومت پر کوئی اثر نہ پڑا مگر جب ۱۳۵۴ھ ش میں شاہ ایران الجزائر گئے اور بومدین کی ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بھی شاہ پر زور دیا کہ علی شریعتی کو رہا کردیا جائے۔ الجزائر سے واپسی کے بعد شاہ نے ان کی رہائی کے احکام جاری کیے اور وہ اٹھارہ ماہ کی قید سخت کاٹ کر جیل سے باہر آئے۔ شاہ کی حکومت نے ان کو آزاد تو کردیا مگر ان پر زبان بندی کی پابندی عائد رہی جس نے علی شریعتی جیسے شعلۂ جوالہ کو کمھلا کر رکھ دیا لیکن اس کے باوجود ان کی کتابیں مخفی طور پر گھر گھر پڑھی جاتیں اور ان کی تقریروں کے کیسٹ ہر گھر میں موجود رہتے۔

قید سے رہا ہونے کے بعد انھوں نے اگرچہ اپنے ذاتی مطالعے اور لکھنے کے شوق کو باقی رکھا مگر چونکہ ان کو کسی فرد واحد تک اپنا پیغام پہنچانے کی اجازت نہ تھی اس لیے انھوں نے اپنی زندگی کا یہ دور ذہنی طور پر ناآسودگی اور پریشانی میں گزارا۔ وہ کبھی مشہد میں رہتے کبھی تہران چلے آتے۔

ہر منزل اور ہر مقام پر خفیہ پولیس والے (ساواکی) ان کی نگرانی کیا کرتے۔ وہ جس شخص سے بھی ملتے اس پر کوئی نہ کوئی الزام لگا کر اس کو پریشان کیا جاتا اور بسا اوقات ان لوگوں کو گرفتار کرکے اذیت خانوں میں پہنچا دیا جاتا۔ ایسے عالم میں علی شریعتی نے لوگوں سے ملنا جلنا بھی کم کر دیا تاکہ ان کی وجہ سے کسی دوسرے شخص کو اذیت خانہ کے عذاب سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ پورے ایران میں کوئی قریہ، کوئی بستی یا کوئی چپہ ایسا نہ تھا جہاں وہ اطمینان وسکون کے ساتھ رہ کر اپنے خیالات کی ترویج و اشاعت کرتے اور تصنیف وتالیف کے کام میں لگ جاتے۔ تقریباً تین برس کا عرصہ انھوں نے زندان سکوت میں گزارا۔ جب ان کو یہ محسوس ہونے لگا کہ اس ماحول میں رہنا ان کے لیے دشوار ہو چکا ہے اور وہ زندہ درگور رہتے رہتے بالکل ہی اکتا گئے تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ایران کو خیرباد کہہ کر کسی اور ملک میں چلے جائیں تاکہ وہ جس زندان سکوت میں گرفتار ہیں اس سے ان کو رہائی ملے۔ شاہ کی حکومت پہلے تو پاسپورٹ دینے میں پس و پیش کرتی رہی لیکن جب اس کو اندازہ ہو گیا کہ اگر علی شریعتی پر مزید سختی کی جائے گی تو ان کی مہر سکوت ٹوٹ جائے گی اور ان کی جو صدا بلند ہوگی وہ لاکھوں لوگوں کو اپنی طرف راغب کرے گی، اس لیے حکومت نے ان کو پاسپورٹ دے دیا تاکہ وہ جس ملک میں چاہیں جاکر اپنی زندگی بسر کریں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ایران میں شاہ کے خلاف مظاہرے شروع ہو چکے تھے۔ سیکڑوں نوجوانوں کی موت کے باوجود ان کی جواں سال بیویاں، بہنیں اور ضعیف وناتواں مائیں "مرگ بر شاہ" کا نعرہ لگاتی ہوئی سڑکوں پر نکلنے لگی تھیں۔ اسی لیے علی شریعتی کو ملک سے باہر جانے کی اجازت دے دی گئی تاکہ وہ اس آگ کو مزید نہ بھڑکا سکیں۔

۲۶ اردی بہشت ۱۳۵۶ ھ ش کو وہ لندن روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچنے کے فوراً بعد وہ اپنے مشن میں لگ گئے۔ ایران سے وہ تنہا لندن آئے تھے جب ان کو لندن میں رہتے ہوئے تین ماہ کا عرصہ گزر گیا تو انھوں نے اپنی اہلیہ اور خورد سال بچیوں کو بھی لندن بلوایا۔ ۲۹ خرداد ۱۳۵۶ ھ ش ان کی اہلیہ اور بچیوں کی روانگی کی تاریخ مقرر ہوئی۔ وقت مقررہ پر جب یہ مختصر سا قافلہ تہران کے ہوائی اڈے مہرآباد پہنچا تو حکام نے ان کی اہلیہ کو ہوائی اڈے پر روک لیا۔ مجبوراً انھوں نے اپنی خوردسال بچیوں کو ہوائی جہاز سے لندن بھیج دیا۔ تہران میں تو یہ ہوا ادھر لندن کے ہوائی اڈے پر علی شریعتی اپنے گھر والوں کے انتظار میں کھڑے تھے، جب ہوائی جہاز آگیا اور ساری سواریاں ہوائی اڈے سے باہر نکلیں تو ان کو علم ہوا کہ ان کی اہلیہ کو روک لیا گیا ہے، انھوں نے چھوٹی چھوٹی بچیوں کو دلاسا دیتے ہوئے اپنے سینے سے لگایا، ان کے آنسو پونچھے اور اپنے ہمراہ لے کر وہاں آگئے جہاں وہ قیام پذیر تھے۔ اس رات وہ دیر تک بچیوں سے باتیں کرتے اور ان کو تسلی دیتے رہے۔ صبح (۱۹ جون ۱۹۷۷ء) کو جب سب کی آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے

ہیں۔ علی شریعتی کو نہ تو قلبی عارضہ تھا اور نہ ہی وہ ان دنوں میں بیمار تھے، اس لیے ان کے پرستاروں کا خیال ہے کہ ان کو ان ساواکیوں نے ختم کیا ہے جو لندن میں مقیم تھے، اسی لیے ان کو شہید کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور آج بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ ان کی موت فطری نہ تھی۔ ان کی موت کی خبر ملتے ہی ان کے پرستار جوق در جوق ان کے گھر آنے لگے۔ ان کے سب سے بڑے لڑکے احسان شریعتی امریکہ میں زیر تعلیم تھے، ان کو امریکہ اور ان کی اہلیہ کو تہران تار دیا گیا۔ ان لوگوں کے آنے کے بعد، تیر ماہ ۱۳۵۶ھ ش کو ان کا جسد خاکی دمشق لے جایا گیا اور اس قبرستان میں ان کو بطور امانت سپرد خاک کیا گیا جو زینبیہ کے نام سے مشہور ہے۔

درج بالا سطور سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ علی شریعتی کو کہیں جم کر نہ تو رہنے کا موقع ملا اور نہ ہی وہ مواقع ان کو مل سکے جب وہ یکسوئی کے ساتھ تصنیف و تالیف کے کاموں میں مشغول ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نام سے چھپی ہوئی جو کتابیں ملتی ہیں وہ بیشتر وہ تقریریں ہیں جو وہ طلبہ کی انجمنوں، مختلف یونیورسٹیوں اور حسینیہ ارشاد کے جلسوں میں کرتے۔ ان تقریروں کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ طلبہ ان کو لکھتے اور ان کی نقلیں ایک دوسرے کو تقسیم کی جاتیں۔ اگر ٹیپ ریکارڈر ہوتا تو تقریریں ٹیپ کی جاتیں اور ان کے کیسٹ ایک دوسرے کو تحفے کے طور پر دیے جاتے۔ اگر ان تقریروں کو بھی ان کی کتاب کا درجہ دے دیا جائے تو ان کی تعداد سو سے بھی متجاوز ہو جاتی ہے اس لیے ہم ذیل میں ان کی کتابوں کی مکمل فہرست نہیں پیش کر رہے ہیں بلکہ ان کی خاص خاص کتابوں ہی کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔

(۱) ابوذر غفاریؓ (۲) تشیع علوی و تشیع صفوی (۳) تشیع سرخ (۴) پیروان علیؓ و رنج ھای ستان (۵) پیروزی در شکست (۶) پیروزی پس از شکست (۷) تولد دوبارۂ اسلام (۸) تاریخ قرون جدید (۹) تاریخ ایران پس از اسلام (۱۰) تاریخچۂ تکامل فلسفہ (۱۱) تمدن و تجدد (۱۲) چہ نیازی بہ علیؓ (۱۳) حسینؑ وارث آدم (۱۴) حج (۱۵) دوبارہ شہادت (۱۶) دروس تاریخ ادیان (۱۷) دروس اسلام شناسی (۱۸) دروس تاریخ تمدن (۱۹) در نقد و ادب (۲۰) راجع بہ شعر (۲۱) رنسانس و تاریخ اروپا (۲۲) علیؓ حقیقتی بر گونۂ ساطیر (۲۳) علیؓ تنہاست (۲۴) علیؓ، یک روح در چند بعد (۲۵) کویر (۲۶) امت و امامت در جامعہ شناسی (۲۷) انسان و تاریخ (۲۸) اگزیستاسیالیزم (۲۹) اقتصاد (۳۰) انسان و جہان (۳۱) اقبال، مصلح قرن آخر (۳۲) اقبال و ما۔

علی شریعتی کی تمام مطبوعہ تحریروں اور تقریروں کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت پر مذہب کی گرفت بہت مضبوط ہے، انہوں نے مذہب اور مذہبی تاریخ کا بہت گہرا اور وسیع مطالعہ کر کے یہ

عرفان حاصل کیا کہ وہ جس مذہب کے پیرو ہیں وہی اصل مذہب کہلانے کا مستحق ہے اور اگر اس مذہب کے تقاضوں کو صحیح طور پر پورا کر دیا جائے، اس کے بتلائے ہوئے اصولوں پر ایمانداری کے ساتھ عمل کیا جائے اور اپنی زندگی کے ہر ہر لمحے کو اس کے سانچے میں ڈھال دیا جائے تو اس جدید سائنس اور ٹکنالوجی کے دور میں بھی انسان ایک پُرسکون، اطمینان بخش، معاشرے کو فائدہ پہنچانے والی اور معاشرے سے برائیوں کو ختم کرنے والی زندگی گزار سکتا ہے۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ ایک راسخ العقیدہ اور نام نہاد روشن خیالوں کے مطابق "واپس ماندہ" خانوادے میں آنکھیں کھولنے کے باوجود علی شریعتی کی مذہبیت نہ صرف برقرار رہی بلکہ اس میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ عام طور سے دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ وہ افراد جو کسی مذہبی گھرانے میں جنم لیتے ہیں وہ گھر والوں کی جکڑبندیوں اور بے جا پابندیوں سے متنفر ہو کر مذہب مخالف اور اگر مذہب مخالف نہ ہوئے تو مذہب بیزار بن جاتے ہیں، لیکن جن خانوادوں کے بزرگ افراد اپنے خاندان کی نئی نسل کے ذہنوں کی کھڑکیوں کو کھلا رکھتے ہیں ان میں تازی ہوا آنے دیتے ہیں ان خانوادوں کے افراد نہ صرف یہ کہ مذہبی رہتے ہیں بلکہ وہ اپنے بزرگوں کی روایات میں توسیع کرتے ہوئے زمانۂ حال کے تقاضوں کے مطابق اپنے مذہب کی تعبیر، توضیح اور تشریح کر کے انتہائی پاکیزہ اور قابل تقلید زندگی گزارتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ علی شریعتی کے والد آقا محمد تقی شریعتی نے بھی علی شریعتی کو بے جا مذہبی جکڑبندیوں اور پابندیوں کا اسیر نہیں بنایا بلکہ ان کو مذہب کی اصل روح اور اس کے مقصد و منہاج کا عرفان حاصل کرنے میں مدد دی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اُسوۂ ابوذرؓ کے زبردست قایل ہوتے ہوئے نہ تو لامذہب ہوئے اور نہ ہی مذہب مخالف۔ اگر صرف اُسوۂ ابوذرؓ کو پیش نظر رکھا جائے اور اسلام کی اصل روح اور اس کے مقصد و منہاج سے صرف نظر کر لیا جائے تو عین ممکن ہے کہ اُسوۂ ابوذرؓ سے عقیدت رکھنے والا کمیونزم کا قایل ہو جائے۔ علی شریعتی کی بہت سی تحریروں کو پڑھتے وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر وہ مذہب کی طرف نہ راجع ہوتے تو اپنے زمانے کے ایک زبردست سوشلسٹ ہوتے، جس چیز نے ان کو خدا پرستی کے انکار سے بچائے رکھا وہ صرف وہ صالح مذہبی روایتیں تھیں جن کی گود میں انھوں نے آنکھیں کھولی تھیں اور جو ان کے خاندان کا خاصہ تھیں، انھوں نے سوشلزم، کمیونزم اور وجودیت تینوں فلسفوں کا عمیق اور محرمانہ مطالعہ کیا اور ان کے جو اجزا اسلام کے بنیادی افکار و نظریات سے متصادم و مزاحم نہ تھے، ان کو بلا تکلف قبول کر لیا اور جا بجا اپنی تقریروں اور تحریروں میں ان کے حوالے دینے سے بھی گریز نہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ شروع شروع میں تو ان کے افکار و نظریات کو سن یا پڑھ کر علماء کا ایک طبقہ چونک پڑا تھا اور ان کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تھا مگر رفتہ رفتہ علماء کے اس طبقہ کی ساری بدگمانیاں ختم ہو گئیں اور وہ صرف نوجوانوں ہی کے نہیں

علماء اور دانش وروں کی بھی آنکھ کے تارے بنتے گئے۔

یوں تو تمام علماء سے علی شریعتی کے تعلقات بہت اچھے اور اکثر علما سے نیازمندانہ تھے جن میں آیت اللہ خمینی اور آیت اللہ مطہری کا نام سرفہرست ہے لیکن یہ دونوں حضرات ان سے عمر میں کافی بڑے تھے اسی لیے علی شریعتی اور ان کے تعلقات دوستی یا بے تکلفی کے تعلقات نہ تھے۔ حجت الاسلام سید علی خامنہ ای کی شخصیت ایسی شخصیت ہے جس سے علی شریعتی بے تکلف بھی تھے اور ان سے دوستی بھی تھی اس لیے ہم درج ذیل سطور میں حجت الاسلام خامنہ ای کے ان تاثرات کا خلاصہ اپنی زبان میں قلم بند کر رہے ہیں جو انھوں نے ماہنامہ سروش تہران کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے ظاہر کیے تھے[1]۔

حجت الاسلام خامنہ ای کے نزدیک علی شریعتی کی زندگی تلاش اور تلاشِ مسلسل سے عبارت تھی، ان کی یہ تلاش مسلسل اس لیے تھی کہ دکھی اور رنج و غم سے گرانبار یہ دنیا اسلام کے پُرسکون اصولوں کی آغوش میں سکون و سلامتی پالے۔ حجت الاسلام خامنہ ای نے یہ بات بھی بہت واضح انداز میں کہی ہے کہ علی شریعتی نے اپنے جو آثار چھوڑے ہیں ان کو بالکل بے عیب قرار نہیں دیا جا سکتا ان کے آثار میں ان کی بشریت کی جھلکیاں بعض بعض جگہوں پر نمایاں ہو جاتی ہیں مگر اس کے باوجود ان کی فکر اس صدی کے ان نوجوانوں کو بہت کچھ دے سکتی ہے جو اسلام کو اپنا ملجا و ماوا بنائے ہوئے ہیں۔ حجت الاسلام خامنہ ای کے نزدیک علی شریعتی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مغربی تمدن کے سحر کو توڑا اور اس کی اصل و حقیقی تصویر اس طرح پیش کی کہ مغربی تمدن بالعموم ایرانیوں اور بالخصوص ایران کے درمیانی طبقہ کی نگاہوں میں ایک بے اعتبار شے بن کر رہ گیا۔

حجت الاسلام سید علی خامنہ ای کا یہ بھی بیان ہے کہ علی شریعتی اپنے زمانے کے جن لوگوں کی شخصیتوں اور تحریروں سے متاثر تھے اور وہ جن کے افکار و خیالات کا مطالعہ کیا کرتے تھے ان میں سید قطب، محمد قطب، علامہ اقبال اور آل احمد کے نام سرفہرست قرار دیے جا سکتے ہیں۔ علی شریعتی نے اسلام کا جو عرفان حاصل کیا تھا اس میں بزرگان دین کے افکار و خیالات کے ساتھ ساتھ مذکورہ بالا افراد کے افکار و خیالات کا بھی بہت بڑا دخل ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

علی شریعتی کی شخصیت اور کارناموں کے بارے میں ایک عالم دین کے خیالات نقل کرنے کے بعد

---

[1] ماہنامہ سروش ۱۰۰، خرداد ماہ ۱۳۶۰ھ ش

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں دانشور طبقہ کے خیالات سے بھی آگاہی حاصل کی جائے تاکہ اندازہ لگایا جاسکے کہ ان کی عبقریت، مذہبیت اور مشرقیت کے معترف صرف علما ہی تھے یا دانشور طبقہ بھی تھا۔ اس سلسلے میں ہم صرف ایک دانشور ڈاکٹر عزتی کے افکار و خیالات کو پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔[1]

ڈاکٹر عزتی کے نزدیک شریعتی کی شخصیت جدید مغربی علوم اور اسلامی علوم کے عمیق مطالعے سے عبارت ہے۔ شریعتی نے ان دو متضاد و متخالف علوم کا اپنی زندگی میں ایسا حسین امتزاج پیش کر دیا ہے جس کی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔ انھوں نے صرف مغربی یونیورسٹیوں ہی میں تعلیم حاصل نہیں کی بلکہ مغرب کی تمام خوبیوں اور خامیوں کا بھی عرفان حاصل کیا اور مغرب کے انداز فکر و نظر سے بخوبی آگاہی حاصل کی۔ ڈاکٹر عزتی کے نزدیک شریعتی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اسلام اور اسلام مخالف افکار و نظریات، اسلامی فکر اور غیر اسلامی فکر، اسلام کے نظری علوم اور مغرب کے نظری علوم ہر چیز سے محرمانہ طور پر آگاہ تھے۔ اپنے اسی گہرے مطالعے و مشاہدے کی وجہ سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ مشرق اور بالخصوص ایران کے عوام جس ذہنی الجھن، پریشانی اور ناآسودگی کا شکار ہیں وہ سب کے سب استعمار کے پیدا کردہ ہیں۔ استعمار نے اپنے پیر مضبوط کرنے کے لیے پہلے تو ایران کی زبان اور اس کے تمدن و تہذیب پر حملہ کرکے ان کی صورت مسخ کر دی اور جب اس زبان، تہذیب و تمدن کے حاملین ہی ان کی صورت پہچاننے سے قاصر رہنے لگے تو اس نے اپنی زبان، تہذیب و تمدن ان کے معاشرے میں رائج کر دیے۔ اس صورت حال کا ازالہ شریعتی کے نزدیک صرف اسی طرح کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان اپنی اصل کی طرف مراجعت کرے تاکہ دوبارہ مسلمان ہو کر ان غیر اسلامی افکار و نظریات کو اپنے معاشرے سے اکھاڑ پھینکے جو دیمک کی طرح اس کے معاشرے کو چاٹے جا رہے ہیں، علی شریعتی کا یہ بھی خیال تھا کہ اسلامی معاشرے میں غرب زدگی کی جو لہر آئی ہے وہ ان حضرات کے طفیل آئی ہے جن کو انٹلکچول کہا جاتا ہے اسی لیے وہ بار بار اس بات پر زور دیتے ہیں کہ سب سے پہلے اس طبقہ کو اصل اور صحیح اسلام سے روشناس کرانا چاہیے تاکہ یہ حضرات غرب زدگی کے طلسم سے باہر نکل سکیں، اگر یہ طبقہ غرب زدگی کے طلسم سے باہر نکل جاتا ہے تو عوام کو اس سے نجات دلانے میں چنداں دشواری نہ ہوگی۔

جہاں تک علی شریعتی کے مذہبی معتقدات کا سوال ہے اس کے بارے میں ڈاکٹر عزتی نے بہت

---

[1] سروش تہران، ۳۰ خرداد ماہ، ۱۳۶۰ھ ش

واضح الفاظ میں یہ لکھا ہے کہ وہ مقلدانہ مذہب کے سخت خلاف تھے اور اندھی تقلید کو دین و ایمان کا سب سے بڑا دشمن گردانتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ علماء جن کا شعار تقلید اور صرف تقلید تھا علی شریعتی کے مخالف ہو گئے، بعض بعض علما نے تو ان کے افکار و نظریات کو اسلامی افکار و نظریات تک ماننے سے انکار کر دیا۔ ایسے علماء کے بارے میں ڈاکٹر عزتی نے لکھا ہے کہ علی شریعتی کے سارے لکچر اور کتابیں شایع شدہ موجود ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کتاب کی کسی تحریر سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ علی شریعتی مسلمان نہ تھے، شیعہ نہ تھے یا روحانیت کے مخالف تھے۔ ان کی تمام کی تمام تحریریں اور تقریریں ان کی اسلام دوستی کو ثابت کرتی ہیں اور ان تحریروں اور تقریروں کی موجودگی میں ان پر کوئی اتہام لگانا درست نہ ہوگا۔

درج بالا سطور سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ خواہ علماء کا طبقہ ہو یا دانش دروں کا، دونوں کے نزدیک علی شریعتی کی علمیت، اسلام دوستی، اسلام کی کامیابی و کامرانی کے لیے جان دے دینے کا جذبہ اپنی جگہ پر مسلم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علی شریعتی کے افکار و نظریات سے جس نے سب سے زیادہ تاثر قبول کیا وہ نوجوانوں کا طبقہ تھا جس کی تمام عقلی و ذہنی راہیں شاہ اور شاہ کے حواریوں نے شراب و جنس کے ذریعے تیرہ و تاریک کر کے رکھ دی تھیں۔

زیر نظر کتاب علی شریعتی کی جس تقریر کا ترجمہ ہے اس کا عنوان "اقبال۔ مصلحِ قرنِ آخر" تھا۔ اسی وجہ سے علی شریعتی نے اس تقریر میں اقبال کی شاعری سے کچھ زیادہ بحث نہیں کی بلکہ اقبال کے اس پہلو پر انہوں نے زیادہ زور دیا ہے جس کو ان کا مصلحانہ پہلو کہا جا سکتا ہے، تحریر اور تقریر میں جو فرق ہوتا ہے اس کو یہاں بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس ترجمہ کو اسی نقطۂ نظر سے پڑھنا چاہیے کہ یہ علی شریعتی کی کسی باضابطہ تحریر کا ترجمہ نہیں ہے۔ تحریر نہ ہونے کی وجہ سے اقبال مصلحِ قرنِ آخر کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے علی شریعتی نے اپنے آپ کو اسی موضوع تک ہی محدود نہیں رکھا ہے بلکہ وہ اپنی فکر و نظر کے دوسرے میدانوں کی طرف نکل گئے ہیں اور اس تقریر کا ایک بہت بڑا حصہ ان مسایل کے لیے وقف ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کمی کے باوجود اس ترجمے سے اردو قارئین کو واقف کرانا اس لیے ضروری معلوم ہوا تاکہ لوگوں کو اندازہ ہو سکے کہ اب ابراہیم پور داؤد کی طرح ایران میں کوئی بھی شخص یہ نہیں کہتا کہ "اقبال شاعری محلی بودہ و در ایران کسی نمی شناسد" (اقبال ایک مقامی شاعر تھے ان کو ایران میں کوئی بھی نہیں جانتا) بلکہ عصر حاضر کے ایران میں اقبال اور کلام اقبال سے شغف بڑھتا جا رہا ہے اور اب ان کی شاعری اور شخصیت کے ہر ہر پہلو پر کام کرنے کا ایران میں آغاز ہو چکا ہے۔

اقبال کی شاعری پر تو انقلاب سے پہلے متعدد ایرانی ناقدوں اور عالموں نے اظہار خیال کیا تھا مگر اقبال شناسی کا جو دور علی شریعتی کی تقریروں کے بعد سے شروع ہوتا ہے وہ پہلے دور سے مختلف ہے ممکن ہے کہ بہت سے حضرات کو علی شریعتی کی باتوں سے اتفاق نہ ہو پھر بھی علی شریعتی کی اس تقریر کو ایسے حضرات اگر اس نقطۂ سے پڑھیں کہ اقبال کے بارے میں ایک خیال یہ بھی ہے تو چنداں مضائقہ نہ ہوگا۔

اس موقع پر میں اپنے ایرانی دوستوں کی توجہ ایک خاص مسئلہ کی طرف مبذول کرانا چاہوں گا میں نے اس کتاب کا ترجمہ اس نسخے سے کرنا شروع کیا جس کو "اتحادیہ محصلین و دانشجویان ایرانی در ہند" نے شایع کیا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت بہت سی جگہوں پر احساس ہوا کہ یہاں عبارت غلط چھاپی گئی ہے۔ یا پروف پڑھنے میں احتیاط نہیں برتی گئی ہے اس لیے اس کتاب کے کسی دوسرے نسخے کی تلاش شروع کی گئی جو ایران کی چھپی ہو۔ ایران کی چھپی کتاب تو مل نہ سکی مگر خوش قسمتی سے "دفتر تدوین و انتشار مجموعۂ آثار شہید دکتر علی شریعتی در اروپا" کی شایع کردہ کتاب کا ایک نسخہ مل گیا جب ان دونوں نسخوں کے متون کا باہم موازنہ و مقابلہ کیا گیا تو محسوس ہوا کہ ان دونوں نسخوں میں سے کسی ایک نسخے کا متن علی شریعتی کی تقریر کے مطابق نہیں ہے اور ان کے کسی نادان پرستار نے ان کے منہ میں اپنی زبان ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ علی شریعتی کے انتقال کو ابھی چار سال کا بھی عرصہ پورا نہیں ہوا، اگر ابھی سے ان کی تقریروں اور تحریروں میں اس طرح کتربیونت کی جائے گی یا ان کو بے توجہی سے شایع کیا جائے گا تو دس بیس برس گزر جانے کے بعد کسی بھی محقق کے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جائے گا کہ علی شریعتی کی اصل تقریر یا تحریر کون سی ہے اگر علی شریعتی کے افکار و خیالات کو زندہ رکھنا ہے اور ان کے اصل خیالات کی ترویج و اشاعت کرنی ہے تو ان کی تحریروں اور تقریروں کے صحیح متون شایع کیے بغیر یہ کام انجام نہ دیا جا سکے گا۔

اس ترجمے کو مکمل کر لینے کے بعد خیال ہوا کہ اگر یہ کسی اہل نظر کی نگاہ سے گزر جائے تو اچھا ہے، اس خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ترجمہ ڈاکٹر نورالحسن انصاری کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ انھوں نے اس ترجمے کے ایک ایک لفظ پر نظر ڈالنے کے بعد مجھے لکھا کہ میں لفظی ترجمہ نہ کروں بلکہ مفہوم کو اپنے پیش نظر رکھوں۔ ڈاکٹر انصاری کی یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے، مگر میں نے اس ترجمے میں "ترجمہ پن" باقی رہنے دیا ہے تاکہ پڑھنے والوں کو یہ التباس نہ ہو کہ یہ کوئی طبع زاد تحریر ہے۔ ترجمہ اور طبع زاد تحریر میں کچھ تو فرق ہونا ہی چاہیے میں ڈاکٹر نورالحسن انصاری کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری درخواست پر اس ترجمے کا ایک ایک لفظ ملاحظہ فرمایا اور اپنے مشوروں سے مجھ کو نوازا۔

مجھے خوشی ہے کہ اس کتاب کی اشاعت اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر کی طرف سے ہو

رہی ہے۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے میرے سارے کاموں کے اصل محرک پروفیسر آل احمد سرور صاحب ہی رہے ہیں۔ انہی نے مجھے علمی و ادبی حلقوں سے روشناس کرایا، انہی کے حکم سے میں برسوں "اردو ادب" اور "فکر و نظر" علی گڈھ میں فارسی ادبیات کے مختلف گوشوں پر مقالے لکھتا رہا۔ اب انہی کے ارشاد کی تعمیل میں اقبال انسٹی ٹیوٹ سے منسلک ہوں اور زیرِ نظر ترجمہ بھی انہی کے حکم کی تعمیل میں کیا گیا ہے۔ میں ان کا انتہائی شکرگزار ہوں کہ وہ مجھے اقبال شناسی کے کوچے میں لے آئے ہیں اور مجھ کو ایسی ذمہ داریوں سے انھوں نے گرانبار کر دیا ہے کہ ان سے عہدہ برآ ہوتے ہوتے ممکن ہے کہ اقبالیات کے بعض ان گوشوں پر کچھ کام کر جاؤں جو ابھی تک نگاہوں سے مخفی ہیں۔

کبیر احمد جائسی

۲۸ر اگست ۱۹۸۱ء

علامہ اقبال

(مصلح قرن آخر)

"جب ہم کسی ایسے عظیم انسان کی معرفت حاصل کرتے ہیں جس نے کامیاب و کامران زندگی گزاری ہے تو ہم اس کی روح کو نہ صرف اپنے جسم میں جلوہ گر کرتے ہیں بلکہ زندگی کے سفر میں بھی اس کے شریک ہو جاتے ہیں اور یہی چیز ہم کو ایک نئی زندگی عطا کرتی ہے"

(شاندل، دفترھای سبز)

یہ اہم اور مفید جلسہ جو حسینیہ ارشاد جیسے تحقیقی اور تبلیغی ادارے کی طرف سے منعقد کیا جا رہا ہے غالباً پہلا جلسہ ہے جس میں ہم اس جدید دور میں اسلامی فکر، انسانی بصیرت اور اسلامی بین المللیت کی عالمگیر سطح پر کوئی علمی، تحقیقی اور منطقی کام کر رہے ہیں۔

یہ جلسہ خود اس احساس کی نشاندہی کرتا ہے کہ محمد اقبال ہمارے عہد میں اسی اسلامی فکر اور انسانی و بین المللی اسلامی بصیرت کے مظہر ہیں۔ اسلام کے اس جمود (جس وقت ہم اسلام کا لفظ استعمال کرتے ہیں اس سے ہماری مراد مسلمان اور مسلمانوں کا معاشرہ ہوتا ہے) اور قومی و علاقائی گنبد بے در میں محصور ہو جانے کی وجہ سے مذہب اسلام کی عالمگیر بصیرت اور جہاں بینی بھلادی گئی ہے اور وہ وحدت جس کی بنیاد مذہب اسلام نے ایک عالمگیر طرز تفکر پر رکھی تھی جو کسی خاص قوم یا مخصوص علاقے تک محدود نہیں تھی تتر بتر ہو چکی ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان گوشہ نشینی اور پستی و بد دلی کی طرف لوٹ آئے ہیں اور روایات، تاریخ، مختلف جاہلی مذاہب کے مخلوط عناصر، غیر اسلامی فکر اور اسلام کے مسخ شدہ عقاید کی چہار دیواری میں گرفتار ہو کر رہ گئے ہیں۔

آج کا یہ جلسہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اسلامی دنیا بالخصوص ایران کے دانشمندوں

مرحلہ میں داخل ہوگئے ہیں کہ وقت اور زمانے نے ان کی شخصیت اور فکر کے گرد جو محدود چہار دیواری کھینچی تھی، اس کو انہوں نے توڑ ڈالا ہے اور اس بات کی کوشش ہو رہی ہے کہ جس سالمیت کو زمانے اور زمانے کے غداروں نے تتر بتر کر کے اس کی شکل مسخ کر دی تھی دوبارہ برقرار ہو جائے اور وہ کلّی یا اسلامی وحدت جس کے بغیر مذہب اسلام ہرگز ہرگز ایک زندہ و متحرک مذہب کی شکل اختیار نہیں کر سکتا۔ اس کی تشکیل جدید ہو۔ تشکیل جدید کی یہ اصطلاح وہی اصطلاح ہے جس کو اقبال نے اپنی عظیم تصنیف "فکر اسلامی کی تشکیلِ جدید" کا عنوان بنایا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس جلسہ سے اسلامی تحقیقات اور ہماری معنوی، علمی، فکری اور اسلام شناسی کی سعی کے ایک نئے دَور کا آغاز ہوگا، اور ہم اس پروگرام سے زیادہ دقیق، کامل اور مفید ترین پروگرام کے ناظر ہوں گے۔

خاص طور سے میری یہ تمنا ہے کہ بہت جلد، دوسرے تمام کاموں سے پہلے ایسا ہی ایک جلسہ اور پروگرام، دنیا کے مسلمانوں کے نیم مردہ تن میں اس "جدید روح" کو جلوہ گر کرنے والے سید جمال الدین کی یاد میں بھی منعقد کیا جائے، جو اونگھتے ہوئے مشرق کی سب سے پہلی صدائے بیداری تھی۔ جس کے افکار کو (اغیار) آج بھی نہ صرف شک و شبہہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں بلکہ اس کے سایے تک سے ہراساں رہتے ہیں اور اس کے افکار پر حملے کیا کرتے ہیں۔ ایسے انسان کے لیے ہم ایسا ہی ایک پروگرام مرتب کریں اور ایک ہفتہ تک اس کی شخصیت اور ان افکار پر بحث و مباحثہ کر کے اس کا عرفان حاصل کریں جس نے نہ صرف اسلامی اور ایرانی سماج پر بلکہ ان تمام قوموں پر اپنا اثر چھوڑا ہے جو پابہ زنجیر تھیں یا فرانز فینن کے الفاظ میں اس نے دنیا کے ان تمام انسانوں پر اپنا اثر چھوڑا ہے جو انسانوں ہی کے ہاتھوں روندے اور ٹھکرائے ہوئے ہیں۔

میں یہ نہیں چاہتا کہ ہم صرف ان کے کارناموں کی تعریف و توصیف کریں، کیونکہ سید جمال الدین اور اقبال جیسے دانائے روزگار افراد کی معرفت حاصل کرنا تنہا ایک فرد یا ایک شخصیت کی معرفت حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ ایک مکتب فکر، ایک آئیڈیالوجی اور خود اپنے حالات و کوائف کی معرفت حاصل کرنا ہے۔

اقبال کی حیثیت ایک باب کے عنوان کی سی ہے اور ہم اقبال یا سید جمال الدین کی معرفت حاصل کر کے ایک ایسے متن سے آشنا ہوئے ہیں جس کا عنوان یہ شخصیتیں ہیں، یہ متن، خود ہمارا متن ہے، ہماری فکر، مشکلات اور مشکلات کو حل کرنے کی راہ کا متن ہے، اس وجہ سے سید جمال الدین اور اقبال کی معرفت حاصل کرنا، اسلام، مسلمان، اور آنے والے زمانے کی معرفت حاصل کرنا ہے۔

میں ان ہزاروں افراد کی طرح جو اس ملک اور اس زمان و مکاں میں کھڑے ہوئے اپنی سرنوشت

اور اس کے مستقبل، دنیا کی موجودہ حالت اور اپنی صورت حال کے بارے میں غور و فکر کر رہے ہیں اور لاچاری میں مشکلات کے حل اور نجات کی راہ تلاش کر رہے ہیں، ایک فرد کی حیثیت سے ایسے لوگوں سے گفتگو کر رہا ہوں جن میں سے ایک میں خود بھی ہوں۔ میں اپنے ہمدردوں سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اقبال اس متلاطم وقت، اس بنجر سرزمین اور اس پُر آشوب ریگستان میں ایک "علامت" ہے جبکہ غور و فکر کرنے والے اصحاب نظر، جس مکتب فکر اور جس مسلک کی طرف بھی رُخ کرتے ہیں اور حل مشکلات کے جس طریقے اور فکر کے جس انداز کو بھی اپناتے ہیں، ان میں سے کوئی بھی ان کو مطمئن نہیں کرتا۔

اور اگر مسایل کے حل کی کوئی راہ ہو بھی جس کے نتیجے میں مقصود حاصل ہو جائے تب بھی ہمارے ہر درد کا نہ تو مداوا ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی تمام ضروریات پوری ہوتی ہیں کیونکہ میں موجودہ نسل سے منسلک ہونے کے باوجود صرف اپنے ملک، اپنے معاشرے اور اپنی تاریخ کے محدود دائرے میں زندگی بسر نہیں کرتا بلکہ میں پوری بیسویں صدی سے وابستہ ہوں اور اگرچہ میں بیسویں صدی میں زندگی بسر نہیں کر رہا ہوں، اس کے باوجود بیسویں صدی کے تمام دکھ درد، تمام مسایل اور اس کے تمام دھارے مجھ پر اور میری فکر پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔

اگر ایک طرف، میں صنعت اور علم کے ہوتے، ان کی گرم بازاری، نام نہاد پیش رفت اور ان کے پیدا کردہ مسایل کے علاوہ وجود انسانی کے اتھل پتھل اور مغربی تمدن کی تباہ کاریوں سے دوچار ہوں تو مجھ پر لازم ہے کہ میں اس زبردست طوفان، ان تمام رنگا رنگیوں اور ان تمام اچھے بُرے جلووں میں رہتے ہوتے بھی جو ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو کر رہ گئے ہیں، اپنے خدوخال کو دریافت کروں تو دوسری طرف، میں اس فضا اور اس وسیع و عریض دنیا کا ایک انسان ہوں اور مجھ پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ اس بات کو جاننے کی کوشش کروں کہ ایک انسان کی حیثیت سے میرے فرائض کیا ہیں؟ مجھ کو کس طرح اور کس انداز سے زندگی بسر کرنی چاہیے؟ میری سرنوشت اور سرگذشت کیا تھیں؟ میری فطرت کیا اور کیسی ہے؟ میں اس دنیا میں کس لیے آیا ہوں اور مجھ کو اس دنیا میں کس مقصد کے تحت زندگی بسر کرنی چاہیے؟ تخلیق اور روح کے معنی کیا ہیں؟ اور وہ منصوبہ کیا ہے جو تخلیق کے عمل پر مسلط رہتا ہے؟ میں کس چیز پر ایمان لاؤں؟ زندگی، اپنے وجود، اپنے معاشرے اور اپنے زمانے کے بالمقابل میری بصیرت کی اساس کس چیز پر ہونی چاہیے؟

دوسری طرف میں ایک ایسی سرزمین کے ماضی، حال اور مستقبل سے وابستہ ہوں جس کو مشرق کہتے ہیں، اس سرزمین کا ماضی، حال اور مستقبل تینوں ترددات اور وسوسوں کو بڑھانے والا اور دردناک

ہے۔ اسی طرح سے میں ایک معاشرے اور ایک امت سے بھی وابستہ ہوں جس کا نام امت مسلمہ ہے۔ میری فطرت، تقدیر، احساس اور مدنیت اسی امت سے جڑی ہوئی ہے یہ امت مسلمہ آج ایک ایسے عالم میں ہے اور ایسے عوامل کے ہاتھوں پریشان و پراگندہ ہو رہی ہے کہ میں مجبور ہوں کہ اس عالم اور ان عوامل کے مقابل ہونے کی ذمہ داری قبول کروں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنے احساسات کی بنا کس چیز کو بناؤں اور کس فلسفہ کو اساس بنا کر اس دنیا پر نظر ڈالوں اور کس چیز پر ایمان لاؤں؟ یہ تمام چیزیں سوالِ بے جواب بن کر رہ گئی ہیں۔

مذاہب کی صورت حال

مذاہب ایک ایسے مخصوص مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ وہ عصرِ حاضر کی بصیرت اور موجودہ دور کے انسانوں کے آلام و مصائب سے خود کو منطبق نہیں کر پاتے اور انسانوں کے آلام و مصائب کا صحیح حل نہیں بتلاتے۔ مذاہب آج کے انسانی معاشرے سے دور ہو گئے ہیں اور ہوتے جا رہے ہیں۔

ڈانواں ڈول علم و فلسفہ

وہ علم جو اس بات کا مدعی ہے کہ وہ ہر سوال کا جواب دے سکتا ہے، اس مشینی، بورژوائی، صنعتی اور تاجرانہ ماحول میں نئی نسل تو کیا دانش مندوں تک کا اس پر سے ایمان اٹھتا جاتا ہے۔

ایسے ماحول میں ایک فرد کی حیثیت سے میری یہ الجھنیں اور یہ پریشانیاں ہیں، مجھے اس کا علم نہیں ہے کہ میں کس چیز پر ایمان لاؤں اور کس پر نہ لاؤں؟ مسایل کے حل کی راہ کون سی ہے؟ ہستی کی حقیقت کلّی کیا ہے؟ اس کائنات کا کوئی مقصد ہے یا نہیں؟

بیسویں صدی کی الجھنیں

بیسویں صدی کی وہ تمام الجھنیں جن سے اس صدی کا انسان اور آج کی متمدن دنیا دوچار ہے، ہم مشرق کے رہنے والے بھی اس کے تمام فساد، آلام و مصائب، بیماریوں اور بدبختیوں سے نہ صرف متاثر ہو رہے ہیں بلکہ ہمارا فساد، ہمارے آلام و مصائب اور ہماری بیماریاں اور بدبختیاں آج کے متمدن یوروپی افراد سے کہیں زیادہ ہیں۔ حالانکہ ہم مشرقی لوگ نہ تو مغرب کے اس تمدن سے استفادہ کرتے ہیں اور نہ ہی اس جدید تمدن کی نعمتوں سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

ہم لوگ ابھی نہ تکنوکریسی (؟) کے عہد میں پہنچے ہیں اور نہ ہی دفتر شاہی کے عہد میں، نہ مشینی دور میں ہیں اور نہ ہی سرمایہ دارانہ دور میں، مگر اس عہد کی وہ تمام پریشانیاں اور علتیں جو مغرب میں ہیں ہم اپنے پورے وجود اور فکر و احساس میں محسوس کرتے ہیں۔ یہ تمام باتیں نتیجہ ہیں اس المیہ کا کہ میں مشرقی

ہوں - علاوہ برایں میں ان جدید نظاموں کے مادی اور معنوی حملوں کی زد میں ہوں -

میں مشرقی انسان ایک طرف تو بیسویں صدی کی ان تمام پریشانیوں اور آلام و مصائب کو محسوس کرتا ہوں جو جدید تمدن کے مادی اور روحانی عناصر ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ مجھ مشرقی کو ایک پس ماندہ معاشرے کی ان تمام پریشانیوں اور دکھوں کو بھی محسوس کرنا چاہیے جو بھوک، جہل اور بدبختی سے عبارت ہیں یعنی میں دو ادوار کے درمیان کھڑا ہوں اور دونوں ادوار کے متضاد اور متناقض دکھ درد کو اپنے وجود میں محسوس کرتا ہوں - ہم مشرقی ایک طرف تو غیر متمدن اور پس ماندہ ہونے کی وجہ سے، انحطاط، مادی وسائل کی کمی، تمدنی کم مایگی، جہالت اور بھوک کے دکھوں کو سہنے پر مجبور ہیں تو دوسری طرف صنعتی، مشینی اور علمی بیش رفت کی وجہ سے بیسویں صدی کے جو مسایل ابھر کر سامنے آئے ہیں، جن میں روح کی ظلمت اور بیماریاں، فلسفیانہ ناامیدی، تنہائی، انحطاط، بگاڑ سب ہی شامل ہیں ان کو بھی انگیز کرنے پر مجبور ہیں -

کون ہے جو ان سوالات کا جواب دے ؟

میرے خیال میں بلاشک وشبہہ سید جمال الدین کی ذات ایسی ہے جو آگاہ بھی ہے اور دردمند بھی - ذمہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی ہے اور مشرقی بھی، اور پھر تحریک اسلامی کا سب سے عظیم موسس بھی - لیکن سید جمال الدین نے جس عظیم تحریک کی بنیاد ڈالی تھی وہ اقبال کے افکار میں اپنے پایۂ تکمیل کو پہنچی ہے اور وہی میرے تمام سوالات کا جواب دے سکتے ہیں - وہ بات جس کو مجھے اپنی تقریر کے آخر میں کہنا چاہیے تھا میں نے اس کو شروع ہی میں کہہ دیا ہے -

میں جب بھی اقبال کے بارے میں سوچتا ہوں میں ان کو "علیؓ گونہ" (علیؓ نما) پاتا ہوں یعنی ایک ایسا انسان جو علیؓ کی سنت کا پیرو ہے لیکن وہ انسان بیسویں صدی کی انسانی استعداد کے کیف وکم کا بھی مکمل نمونہ ہے -

کیوں ؟ اس لیے کہ علیؓ کی شخصیت وہ شخصیت ہے جو صرف اپنے کلمات اور افکار ہی سے نہیں بلکہ اپنے وجود اور اپنی زندگی کے ذریعے ہر دور کے تمام انسانوں کے دکھ درد، مسایل اور کثیر الابعاد بشری حاجتوں کے حل کی راہ بتاتی ہے اور ان کے سوالات کا جواب دیتی ہے لیکن یہ علیؓ اور یہ اسلام، تاریخ کے طول وطویل عرصہ میں ان مختلف عوامل کے زیر اثر جن کی تفصیل میں جانے کا یہ وقت نہیں، تتر بتر ہوگیا ہے، اسلام ہمارے درمیان سے ختم نہیں ہوا اور نہ ہی علیؓ ہمارے درمیان سے پوشیدہ ہوئے ہیں، مکتب اسلام اب بھی باقی ہے -

جس چیز نے مکتب اسلام کو انقلابی حوادث اور زندگی کی سرگرمیوں سے محروم کر دیا ہے وہ اسلامی ڈھانچے کا بکھر جانا ہے نہ کہ اس کا ختم ہو جانا۔ انسانی تاریخ میں مذہب اسلام وہ پہلا مکتب فکر تھا جس نے اس مذہبی احساس اور مذہب کی اس معجز نما قوت کو جو فرد کے ذہن و روح میں ہمیشہ سے نہاں تھی، تزکیۂ نفس اور مرد کامل کی تخلیق میں مصروف عمل رکھا اور پھر اس فطری روحانی قوت کو ایک خارجی اور اجتماعی شکل دے کر انسانی معاشرہ کی تشکیل کی جہت متعین کی اور انسانی معاشرے کی رہبری کرتے ہوئے اس کو مرتب و منظم کرنے کا کام اپنے ہاتھوں میں لیا۔

ہمارے نزدیک رہبری کا نظریہ یہ نہیں ہے کہ اخلاقی رہبری کا فریضہ تو "مسیح کے ہاتھوں میں دے دیا جائے اور سیاسی رہبری قیصر کے ہاتھوں کو سپرد کر دی جائے" اسی طرح زندگی کا بھی نظریہ یہ نہیں ہے کہ ہم اپنی اخروی زندگی کے لیے تو دین کو اساس بنائیں لیکن ہماری دنیوی زندگی کی اساس عقلیت پسندی پر ہو، اور انسان کے بارے میں بھی ہمارا خیال یہ نہیں ہے کہ اس کا خلقی و باطنی میلان یہ ہے کہ وہ علم اور مادیت کے نظریات کو بلا کسی عالمگیر توجیہ اور دنیا کی کلیت پر نظر رکھے بغیر قبول کر لیتا ہے۔

اسلام نے اپنے انفرادی، اجتماعی، مادی اور معنوی طرز فکر کی اساس توحید پر رکھی ہے جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ توحید صرف انہی حدود و تنگ محدود و محصور نہیں ہے جن تک فلسفیانہ اور کلامی نظریات کے خالق دانش ور اور مذہبی رہنماؤں نے اس کو محدود و محصور سمجھا ہے۔

توحید جس کے معنی وحدت ذات خدا کے ہیں اس دنیا کے منطقی، مادی اور انسانی تصورات و مقتضیات کی حامل ہے۔ اس توحید پر اعتقاد کی اساس "ایک انسان" ایک انسانی طبقہ اور موجودات کی وحدت عمومی (کے اعتقاد پر) ہے جس کی راہ پر چل کر انسان اپنی فطری ارتقا کی طرف گامزن ہوتا ہے

توحید اسلامی کے یہی معنی ہیں، اس توحید اسلامی کی بنیاد صرف فلسفیانہ اور مذہبی افکار پر ہی نہیں رکھی گئی ہے بلکہ عمرانیات، علم بنی نوع انسان اور حیاتیات پر بھی مبنی ہے۔

اس دین توحید میں علیؑ اور وہ تمام بزرگ و برتر شخصیتیں ہیں جن کی تربیت مکتب اسلام اور خود پیغمبرؐ کے ہاتھوں ہوئی یہ بھی دو بُعدی شخصیتیں ہیں۔ علیؑ کی شخصیت وہ شخصیت ہے کہ جب ان پر باطنی جذبات طاری ہوتے ہیں تو وہ ایک ایسی روح کی یاد دلاتے ہیں جو تمام علایق دنیوی سے مبرّا ہے اور جب ان کی معنوی معراج ہوتی ہے تو وہ زمین کی راہوں کے مقابلے میں آسمان کی راہوں کو زیادہ بہتر طور سے شناخت کرتے ہیں۔ علیؑ کی روح ایک ایسی روح ہے جس کو پوری رات اس لیے نیند نہیں آتی کہ اسلامی معاشرہ سے دور بہت دور ایک شخص بھوکا سو گیا ہے۔ یہ ایک ایسی روح ہے جو صرف ایک فرد

کی بھوک پر نہیں بلکہ معاشرہ کی بھوک پر اس قدر حساس ہے (کہ اس کی راتوں کی نیند اڑ گئی ہے) یہ شخصیت بالکل ایک مادی اور عوامی لیڈر کی شخصیت کی طرح ہے جو عوام کی مادی زندگی کی فلاح و بہبود کے علاوہ کچھ اور نہیں سوچتا۔ تو دوسری طرف ان کی شخصیت ایک ایسے فلسفی کی طرح ہے جو خلوت، سکوت اور باطنی کیفیات میں اس طرح مستغرق ہے گویا کہ وہ دنیا کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا ہے۔

یہ "صاحب سیف و قلم، صاحب عشق و فکر" ایک ایسا انسان ہے جس کی تلوار سے تو موت برستی ہے اور زبان سے وحی۔ یہ شخص انسانی کمال کے نمونے کی ایک تمثیل ہے۔ مذکورہ بالا بزرگ و برتر اصحاب اسلامی اور انسانی تاریخ کے وہ مثالی نمونے ہیں جن کی نشاندہی کر کے پیغمبر اور ان کا مکتب فکر لوگوں کو بتلاتا ہے کہ اپنے آپ کو اس سانچے میں ڈھالو۔

وہ انسان جو نمونۂ کمال ہوتے ہیں ان کا شمار انسانوں کی اس نوع میں کیا جاتا ہے جن کو عمرانیات کی اصطلاح میں PHOMMETOTAL کہتے ہیں یعنی ایک ایسا انسان جو ہر طرح سے کامل بھی ہو اور مثالی نمونۂ کمال بھی۔

امام کے ایک معنی یہ بھی ہیں یعنی ایک انسان نما اعلیٰ نمونہ۔ علیؓ کی شخصیت (کا یہ پہلو) اور مکتب اسلام تو اپنی جگہ پر باقی ہے مگر اس کے اجزا باہم دگر درہم برہم ہو گئے ہیں بالکل اسی طرح جیسے میں تو باقی رہوں مگر میرے ہاتھوں کو کاٹ کر ایک جگہ لے جایا جائے اور پیروں کو کاٹ کر دوسری جگہ۔ میرا سر جدا کر کے کہیں پہنچا دیا جائے اور آنکھیں کہیں اور۔ دل کو کہیں لے جائیں اور دماغ کو کہیں، میں کلی طور پر موجود رہا ختم نہیں ہوا، یہاں تک کہ لوگ میری تعظیم کریں گے، ہمیشہ سے زیادہ بلکہ مبالغہ آمیز حد تک مجھ کو پاک اور منزہ سمجھیں گے مگر میرے لیے یہ ممکن نہیں ہوگا کہ میرے اندر زندگی اور حرکت ہو کیونکہ میں زندہ نہیں ہوں۔

علیؓ کا عرفانی پہلو، انتہائی نکھرے نکھرائے، بلند و برتر عمیق اور انتہائی بالیدہ و لطافت انسانی کے حامل تصوف کے عنوان سے مکتب اسلام میں پروان چڑھا (ہم کو اس مکتب (تصوف) کے غلط طور سے استعمال ہونے سے کوئی غرض نہیں ہے کیونکہ ہر مکتب کا غلط استعمال بھی ہوتا ہے۔)

معاشرے کے ایک دوسرے طبقے میں، عرفانی پہلو سے بالکل الگ علیؓ کی شخصیت کا غازیانہ پہلو، جوانمردی، فتوت اور بہادری کی مجسم علامت کے طور پر پروان چڑھا۔

ان کی حکمت، علم اور قرآن شناسی کا پہلو، تفسیر، اسلام، حدیث کی شناخت کے منبع و سرچشمہ

کی حیثیت اور ایمانی و اسلامی علوم کے اساس کی حیثیت سے برگ و بار لایا۔
ان کی شخصیت کا فکری پہلو، تفکر اور علم و سخن کے ایک مظہر کے عنوان سے نمو پذیر ہوا۔
ان کی شخصیت کا سیاسی پہلو، صرف حق طلبی و انصاف کے مظہر ہی کے روپ میں پروان نہیں چڑھا بلکہ اس کو تاریخ کے مارے، کچلے کچلائے لوگوں کے ازدحام میں خدائے انصاف وحق کے پیکر میں اس طرح دیکھا گیا کہ اس کے ڈانڈے الوہیت کے ڈانڈے سے مل گئے۔
میں دیکھ رہا ہوں کہ علیؑ تو موجود رہے مگر ٹکڑے ٹکڑے، اسلام تو باقی رہا مگر درہم و برہم اور بکھرا ہوا۔

یہی وجہ ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ قرآن موجود ہے اور یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ مکتب اسلام کی تربیت یافتہ ممتاز و نمایاں ترین شخصیتیں بھی ہمارے معاشرے اور ملت میں موجود ہیں۔ ان میں سے ہر شخص ایک ہی جیسا دکھائی دیتا ہے، مگر ان میں سے ہر شخص ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے، ان کے ہر ٹکڑے نے کلیت کا درجہ حاصل کر لیا ہے اور ان سب ٹکڑوں کی الگ الگ مدح و ستائش ہو رہی ہے۔

تجدید ساختمان

"تجدید ساختمان" کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے تمدن، موجودہ علوم و فنون، اسناد، تاریخ، (بزرگوں کے) حالات زندگی اور ان کے فکری عوامل و عناصر کی طرف مراجعت کر کے ان (کی روشنی) میں ان شخصیتوں کو تلاش کریں۔ مزید برآں ہم علامتی، اساطیری اور افسانوی ہیروؤں کے انسانی ابعاد کی نہیں بلکہ (مکتب اسلام کے) تربیت کردہ ان "مثالی نمونوں" کی انسانی ابعاد اور اساسی عناصر کو تلاش کریں جو واقعی اور جسمانی طور پر وجود رکھتے ہیں ہم ان شخصیتوں اور اس عظیم مکتب کی تشکیل نو کریں یعنی ہم دوبارہ "مثالی انسان" کی تخلیق کریں اور یہ کتاب جس کا ہر باب اور ہر ورق مختلف ہاتھوں میں بکھرا ہوا ہے اس کی شیرازہ بندی کر کے ازسر نو اس کو اس کی اولین شکل کے مطابق بنا دیں۔

کیونکہ ایک جسم اور ایک واقعی و اصلی کل میں ایک روح اور ایک ہی فکر کا وجود ہوتا ہے لیکن اگر ہم اس جسم یا کل کے عناصر کو جدا جدا کر دیں گے تو اس کی تاثیر ختم ہو جائے گی۔ ان الگ الگ عناصر یا اعضا کی ہم خواہ کتنی ہی تعظیم و تکریم کیوں نہ کریں، ان کو ہم خواہ کتنا ہی مکمل اور ترقی یافتہ کیوں نہ بنائیں، وہ روح جو اس جسم یا کل میں تھی نکل جائے گی اور وہ شخصیت جو اس روح اور فکر سے عبارت تھی ختم ہو جائے گی۔ اس جسم کی جب حقیقی تشکیل نو ہو جائے گی تب ہی اس جسم میں روح پیدا ہو سکے گی اس عہد کا اسلام ہمارے اندر حرکت پیدا نہیں کرتا بلکہ ہم کو سکوت، سکون اور قناعت کا

درس دیتا ہے۔ (یہ اسلام) جو صبر و قناعت ہم کو سکھاتا ہے اس کے معانی ومفاہیم وہ نہیں ہیں جو اسلامی معانی ومفاہیم ہیں بلکہ یہ خود ہمارے وضع کردہ ہیں (ہمارے مفہوم صبر و قناعت اور اسلام کے مفہوم صبر و قناعت میں بڑا تضاد ہے) جو موجودات سے ناامیدی، معاشرہ، قدرت، زندگی اور حیات اسلام سے مایوسی سے عبارت ہے اور دین دار ہونے کے نام پر (یہ اسلام) ہماری تمام امیدوں اور آرزوؤں کو مرنے کے بعد کی زندگی کا تابع بنا دیتا ہے۔

یہ روح اپنی اولین شکل میں کب سامنے آئے گی، جس نے صرف پچیس برسوں کے اندر آدمی کو بربریت سے نکال کر ایک ایسا انسان بنا دیا جو تمدن آفرین، دنیا میں ایک نئی تاریخ کا آغاز کرنے والا، تاریخ کا رُخ موڑنے والا اور جس تاریخی جبر کا آغاز ہو چکا تھا اس کا منہ پھیر دینے والا تھا، یہ مکتب کب جندبؓ جیسے ایک نیم متمدن ان پڑھ بدو کو جو نہ صرف دنیا سے بے خبر تھا بلکہ اپنے ملک کے بارے میں بھی کچھ نہ جانتا تھا، دوبارہ ابوذر غفاریؓ کی صورت میں پیدا کر سکے گا؟ ایسا شخص (ابوذر غفاریؓ) کب پیدا ہوگا جو آج بھی ایک صورت مجسم، انسانی سعادت کی حرکت کو الہام بخشنے والا اور محروم و غارت شدہ انسانوں کے لیے پیام امید بھی ہے۔

قرون وسطیٰ کے تیرہ و تاریک اور طویل دور تاریخ میں یہ جسم جو تتر بتر ہو چکا ہے، اس کی ہم دوبارہ شیرازہ بندی اور تجدید کریں تاکہ یہ روح اس جسم میں صحیح اور مکمل طور پر دوبارہ واپس آجائے اور یہ مادّہ (جوہر) جو فی الوقت دماغوں کو مختل اور خوابیدہ کیے ہوئے ہے دوبارہ روح القدس کے اس پیکر میں ڈھل جائے جس نے صور اسرافیل کی طرح بیسویں صدی کے بے جان معاشرہ میں نہ صرف روح پھونکی بلکہ اس نے اس مردہ معاشرے میں حرکت، قوت، زندگی اور معانی کو بھی جنم دیا۔

یہ "مسلمان مثالی انسان" انسانی عناصر کی تجدید اور شیرازہ بندی کی شکل اور ایک ایسے نئے قالب میں جلوہ گر ہوا جو بیسویں صدی سے منسلک بھی ہے اور اس سے دور بھی۔ یہ نوخیز اور نو ساختہ شخصیت محمد اقبال کی شخصیت ہے۔

اقبال، غزالی، محی الدین عربی یا مولانا رومؔ کی طرح کے مسلمان عارف نہیں ہیں جو صرف متصوفانہ اور ماورائی حالات کے بارے میں غور و فکر کرتے رہے اور اپنے انفرادی تکامل، تزکیۂ نفس اور روشن ضمیری کی وجہ سے اپنے ہی جیسے چند آدمیوں سے راہ و رسم رکھے رہے لیکن باہر کی دنیا سے اس طرح غافل تھے کہ ان کو منگولوں کے حملے، حکومت کے جبر و ستم اور عوام کی بندگی و بے چارگی کی خبر بھی نہ ہو سکی۔

نہ ہی محمد اقبال ابو مسلم (خراسانی) حسن صباح اور صلاح الدین ایوبی وغیرہ کی طرح ہیں جو تاریخ اسلام میں اپنی تلوار، قوت اور جنگ و جدال میں تو مشہور زمانہ ہیں نیز فکری انقلاب، اجتماعی روابط اور انسانی تربیت کے لیے وہ صرف زور و قوت ہی کو کافی سمجھتے ہیں اور زور و طاقت کے ذریعے دشمن پر تسلط پالینا ہی ان کا مطمح نظر ہے۔ نہ ہی محمد اقبال، سر سید احمد خاں اور اس قبیل کے دوسرے ہندستانی علما کی طرح ہیں جو اس بات کے قایل ہیں کہ اسلامی معاشرہ کی حالت خواہ کچھ بھی ہو اگر انگریز نائب السلطنت کے زیر تسلط مروجہ علوم اور بیسویں صدی کے منطقی و عقلی تاویلات کے مطابق قرآنی آیات کی عالمانہ، محققانہ اور فلسفیانہ انداز میں ایک تفسیر لکھ دی جائے تو اسلام کا احیا ہو جائے گا۔

اقبال کی شخصیت وہ شخصیت ہے جو نہ تو اہل مغرب کے اس خیال کی موید ہے کہ علم ہی انسان کی نجات، ارتقا اور تمام دکھ درد کا مداوا ہے اور نہ ہی وہ ان فلسفیوں کے ہم خیال ہیں جو انسان کی معاش اور معاشی ضرورتوں کو اس کی تمام ضرورتوں کا سرچشمہ سمجھتے ہیں اور نہ ہی اپنے ہم وطنوں یعنی بودھوں اور ہندوؤں کے بڑے بڑے مفکروں کی طرح اس بات کے قایل ہیں کہ انسانی روح کا اس سنسارک جیون اور کرم کے اس چکر سے نکل کر نروان حاصل کر لینا ہی بشریت کی معراج ہے۔ وہ اپنے ہم وطنوں کے اس خیال کے بھی قایل نہیں ہیں کہ ایک ایسے ماحول میں جہاں بھوک، غلامی، ذلت و پستی موجود ہو، وہاں پاک و منزہ روحیں، سعادت مند اور "تربیت شدہ" انسان اور پاکیزہ اخلاقیات کو جنم دیا جاسکتا ہے۔

نہیں، اقبال بنیادی طور پر اپنے مکتب فکر اور خود اپنی ہستی کے ذریعے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ جس فکر یعنی اسلام کے معتقد ہیں وہ فکر اگرچہ دنیا اور انسان کی مادی حاجتوں کی طرف پوری توجہ دیتی ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ انسان کو ایک ایسا دل بھی بخشتی ہے کہ خود انہی کے قول کے مطابق "وہ سپیدۂ سحری کے ذوق و شوق اور غور و فکر میں زندگی کے خوبصورت لمحات کو دیکھتا ہے" ان کی مثال ایک عظیم صوفی کی سی ہے جس کی روح نتھری نتھرائی اور مادیت سے کنارہ کش ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایک انسان بھی ہیں جو ہمارے زمانے کی علمی، تکنیکی اور بشری تعقل کی پیش رفت کو احترام کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

اقبال کا وجدان و احساس، تصوف، مسیحیت یا لاؤزی، بودھی اور جینی مذاہب کے احساس و وجدان کی طرح نہیں ہے جو علم، عقل اور علمی پیشرفت کو تحقیر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اسی طرح ان کا علم بھی فرانسس بیکن اور کلوڈ برناڈ کی طرح کا وہ خشک علم نہیں ہے جو صرف مظاہر قدرت کے باہمی ربط اور مادی زندگی کے لیے طبیعی قوتوں کے استعمال تک محدود ہو۔ اسی کے ساتھ ساتھ اقبال ایسے مفکر بھی نہیں

ہیں جو فلسفہ، وجدان علم دین، عقل اور وحی کو باہم دگر اس طرح خلط ملط کر دیں جس کی مہمل ترین مثال دارا شکوہ اور اس کے قبیل کے دوسرے مفکرین ہیں۔

وہ اس دنیا پر نظر ڈالتے وقت تعقل اور علم کو تو انہی معنوں میں استعمال کرتے ہیں جو آج معروف ہیں مگر ان کے نزدیک علم و تعقل کا منتہا و مقصود وہ نہیں ہوتا جو ہمارے زمانے میں سمجھا جاتا ہے بلکہ ان کے نزدیک علم و تعقل کا منتہا و مقصود یہ ہے کہ یہ دونوں عشق، احساس اور الہام کے مددگار، ان کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے اور قدم سے قدم ملا کر چلنے والے ہیں (اسی بنا پر) اقبال انسانی روح کے سفر تکمیل میں علم اور تعقل کو انسانی روح کا ممد و معاون سمجھتے ہیں۔

بنی نوع انسان کے نام اقبال کا سب سے عظیم پیغام یہ ہے کہ اس کا دل (حضرت) عیسیٰ کی طرح، فکر سقراط کی طرح اور قوت و طاقت قیصر کی طرح ہو مگر یہ تمام صفات ایک انسان یعنی ایک وجود بشری میں مجتمع ہوں اور ان تمام صفات کی اساس ایک ہی روح پر ہو جو ایک مقصود یعنی خود اقبال تک پہنچ سکے۔

اقبال کی شخصیت اپنے زمانے کی بیدار ترین شخصیت تھی، اتنی بیدار کہ لوگ ان کو ایک سیاسی رہنما، ایک رہبر آزادی اور بیسویں صدی کی استعماریت کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں ان کی علمی اور فلسفیانہ شخصیت کی بلندی کا عالم یہ ہے کہ آج کی مغربی دنیا ان کو برگساں کی طرح کا ایک فلسفی اور مفکر تسلیم کرتی ہے۔

تاریخ اسلام میں اقبال کا شمار غزالی کی صف میں ہوتا ہے اسی کے ساتھ ساتھ ہم ان کو اسلامی معاشرہ کا ایک مصلح بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ انسانی، اسلامی اور اس معاشرے کے سلسلے میں سوچ بچار کرتے رہتے ہیں جس میں وہ خود زندگی بسر کرتے ہیں اس معاشرے کی نجات اور آزادی کے لیے وہ جہاد بھی کرتے ہیں، ان کا یہ جہاد علمی یا تفنن طبع کے طور پر یا سارتر کے الفاظ میں "بائیں بازو کے روشن فکرانہ سیاسی مظاہر پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس ضمن میں وہ ایک ذمہ دار اور متعہد کی حیثیت سے اس مسئلہ پر نگاہ ڈالتے ہیں، کام کرتے ہیں اور راہ نجات کی تلاش بھی کرتے ہیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ اقبال، مولانا روم کے بھی عاشق ہیں۔ مولانا روم کی روحانی معراج میں اقبال ان کے ہم سفر ہوتے ہیں، روحانی عشق و عاشقی اور درد و اضطراب سے داغ داغ ہو کر ان میں سوز و گداز پیدا ہوتا ہے۔

لیکن وہ ایک ایسے عظیم انسان ہیں جو یک رُخے نہیں ہیں، ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوتے،

ایک ایسے مسلمان ہیں جن کی شخصیت کسی ایک ہی رُخ یا کسی ایک ہی پہلو کی اسیر ہو کر نہیں رہی بلکہ وہ "مکمل و سالم مسلمان" ہیں، اگرچہ وہ مولانا روم سے عقیدت و محبت رکھتے ہیں مگر کسی وقت بھی ان کی شخصیت مولانا کی شخصیت میں ضم نہیں ہوتی اور نہ ان کی شخصیت کسی ایک پہلو کی طرف جھکاؤ رکھنے کی وجہ سے اسی پہلو کی طرف خم ہوتی ہے۔

اقبال ایک فلسفی کی حیثیت سے یوروپ گئے اور وہاں کے آسمان پر چمکے، انہوں نے مغرب کے فلسفیانہ مکتب فکر کو سمجھا اور لوگوں کو سمجھایا۔ تمام لوگوں کو اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ بیسویں صدی عیسوی کے فلسفی ہیں لیکن اس کے باوجود اقبال مغربی فکر کے اسیر ہو کر نہیں رہے بلکہ انہوں نے مغرب کو مسخر کیا اور ایک ناقدانہ فکر اور قوت انتخاب کے ساتھ بیسویں صدی اور مغربی معاشرہ میں زندگی بسر کرتے رہے۔ اقبال مولانا روم کے شیفتہ و مرید بھی ہیں لیکن ان کے مقابلے میں اقبال نے اپنی اصل جہتوں کو اس طرح محفوظ رکھا ہے کہ وہ اصل اسلامی روح سے مختلف نہیں۔

تصوف کا کہنا ہے:

چو قسمت ازلی بی حضور ما کردند
گر اندکی نہ بہ وفق رضاست خردہ مگیر

یا

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

مگر صوفی اقبال کا کہنا ہے ؎ زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

زمانے کے معنی انسان کی سرگذشت و سرنوشت اور خود اس کی زندگی ہے، انسان ایک لہر ضرور ہے مگر ساحل پر پڑی ہوئی لہر نہیں ہے اور اس کی زندگی یا وجود اس کی حرکت میں مضمر ہے۔ انسان، اقبال کی فکر کے سہارے جو نہ ہندستانی تصوف ہے اور نہ ہی مذہبی عصبیت بلکہ "قرآنی عرفان" ہے زمانے کو متغیر و منقلب کر سکتا ہے۔

اسلام اور قرآن نے اس "تقدیر آسمانی" کی جگہ جس میں انسان کی حیثیت ہیچ ہے، "تقدیر انسانی" کو دی ہے جس میں انسان ایک اساسی کردار انجام دیتا ہے۔

یہ انقلاب کی سب سے بڑی اور ساتھ ہی ساتھ ایسی ترقی پسند اور سازگار بنیاد ہے جو اسلام نے بنی نوع انسان کو اس کی آفاقیت، فلسفۂ زندگی اور انسان شناسی کے ضمن میں عطا کی ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کے حامیان حقوق انسانی (HUMANISTS) اور آزاد و روشن فکر

حضرات مذہب کے سلسلے میں جو سب سے بڑی تنقید کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جس مذہبی عقیدے کی بنیاد آسمانی ارادے کی قاہریتِ مطلق یعنی مشیت الہٰی اور ارادۂ زمین کی مقہوریت مطلق یعنی انسانی خواہش پر استوار ہو۔ اس کے نزدیک انسان غیبی طاقت کے ہاتھ میں ایک بے شعور اور کمزور کھلونا ہے۔

یہ نظریہ بجائے خود انسان کی ذلت و غلامی کا سبب بھی ہے اور اس کی قدر و آزادی کو سلب کرتا ہے، ساتھ ہی ساتھ انسانی ذمہ داریوں کی بھی نفی کرتا ہے جس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ ابھی موجودہ حالت پر صابر و شاکر رہتا ہے اور جو واقعات اسے پیش آتے ہیں ان پر راضی برضا رہتا ہے۔ اور یہ دنیا اس کو جو کچھ بھی دیتی ہے اس کو (بے چون و چرا) قبول کر لیتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ موجودہ حالات کو بدلنے کے لیے جو مساعی اور اصلاحات ہوتی ہیں ان پر نہ صرف تنقید کرتا ہے بلکہ ان کو بیکار اور فضول بھی گردانتا ہے اور جو کچھ بھی ہوا یا ہوتا ہے یا ہوگا ان سب چیزوں کو وہ تقدیر آسمانی سمجھتا ہے۔

اس نقطۂ نظر کے مطابق تغیر و تبدل اور اصلاحات کی تمام انسانی تدبیریں ناممکن بھی ہیں، نامعقول بھی اور نامشروع بھی۔ لیکن اسلامی فلسفہ کے نقطۂ نظر سے باوجودیکہ خدائے واحد مطلق آمریت اور جبروت کا حامل ہے اور خلق و امر یعنی پیدا کرنے، ہدایت دینے اور دنیا پر حکومت کرنے کا حق اپنے اختیار میں رکھتا ہے (لہ الخلق والامر) لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ دنیا کی اس عظیم اور مستبدانہ مملکت میں انسان کی تخلیق اس نہج سے کرتا ہے کہ اگرچہ اس کا وجود خدائی قلمرو اور قانون سے روگردان نہیں ہو سکتا ہے تاہم وہ آزادانہ طور پر زندگی بسر کرتا ہے۔ خدا انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے

"میں نے تم کو عزت دی اور خشکی و تری، زمین اور آسمان کو تمھارے اختیار میں دیا اور اپنی روح جو کہ ارادہ، قدرت، تخلیق، انتخاب، رہبری، تدبیر، خود آگاہی خدمت، تفکر اور ما فوق الطبیعت استعدادوں سے عبارت ہے تم میں جلوہ گر کی تاکہ میں جان سکوں کہ تم میں نیک ترین کون شخص ہے"[1]

---

[1] یہ کسی ایک آیت کا ترجمہ نہیں ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شریعتی نے تین آیات کے مفہوم کو ملا کر ایک آیت کے طور پر بیان کیا ہے۔ وہ آیات یہ ہو سکتی ہیں: (۱) وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ۝ (۲) فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ سٰجِدِينَ ۝ (۳) الذی خلق الموت والحيوٰة ليبلوكم ايكم احسن عملا ۝ (مترجم)

اسلام جس انسان کا تصور پیش کرتا ہے وہ ارادہ، قدرت، بغاوت اور تسلیم و رضا سے عبارت ہے، اسی وجہ سے وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور اپنی تصویر آپ بناتا ہے۔ کل نفس بماکسبت رہینہ (ہر فرد اپنے اعمال کے ہاتھوں رہن ہے) اور انسان کے لیے سوائے ان چیزوں کے جن کو اس نے اپنی کوشش، فعالیت اور تلاش کے ذریعہ حاصل کیا ہے کوئی دوسری چیز نہیں ملتی۔ لیس للانسان الا ماسعی (وہی کچھ انسان کے لیے ہے جس کے لیے وہ کوشاں ہے)

اقبال اپنے عرفانی سفر میں قرآن کے ذریعہ سے اسی حقیقت، یعنی انسان کی آزادیٔ عمل اور ذمہ داریٔ (عمل) تک پہنچتے ہیں جس کے ذریعے سے علمائے کل، علمائے وجودیت اور علمائے اصلاحات اساسی (RADICALISTS) انسان کو خدا کے انکار اور مذہب کی نفی کی منزل تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ واقعتاً (وہ لوگ) مذہب اور ذہنوں میں رائج مذاہب کے سربراہوں کو انسانی آزادی، عزت، آزادیٔ عمل و ارادہ کے بالعکس دیکھتے ہیں۔ حالانکہ اسلام بالکل صاف صاف، ہر ممکن فلسفیانہ تاویل و توجیہ سے پاک یہ اعلان کرتا ہے کہ انسان کی سرنوشت کی انتہا اس دن ہوگی جب وہ وہی چیز دیکھے گا جو اس نے خود اپنے ہاتھوں سے انجام دے کر پہلے سے وہاں بھیج دی ہے۔ یوم ینظر المرء ماقدمت یداہ (جس دن انسان اپنے ہاتھوں کے پیش کردہ اعمال کا مشاہدہ کرے گا)

اقبال نے موجودہ دور کی تمام فلسفیانہ اور روحانی منازل کو اپنے اسلامی عرفان اور ایمانی بصیرت و بصارت کے ذریعے طے کیا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک مہاجر مسلمان ہیں، جو ہندستان کے پُراسرار سمندر کی گہرائیوں سے نکل کر اور یوروپی اقتدار کی بلند ترین چوٹی تک جا پہنچے لیکن وہ اس چوٹی پر جمے نہیں رہے بلکہ اپنے تعجب خیز سفر کی داستان لے کر ہمارے درمیان واپس آ گئے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اسلام نے ایک بار پھر بیسویں صدی میں اپنی خود آگاہ، دردمند مگر پریشان حال نسل کے لیے اقبال کی شخصیت کی شکل میں "نمونہ سازی" کی ہے۔

(اسلام کی اس نمونہ سازی نے) مشرق کی سرزمین سے جو روحانیت اشراق اور محبت کی سرزمین ہے، ایک پرگداز اور مشرقی الہام سے بھرپور شخصیت کو چُن لیا اور عقل و علم کی سرزمین یعنی مغرب کے اعلیٰ و عظیم افکار کو ان کی تمام قدرت، خلاقیت اور پیش رفت کے ساتھ اس کے دماغ میں جاگزیں کر دیا اور پھر اس طرح کے سرمایے (شخصیت) کو بیسویں صدی عیسوی کی شناخت کی علامت بنایا۔

اقبال ان رجعت پسندوں اور ماضی پرستوں میں نہیں ہیں جو جدید یا مغربی تہذیب کی ہر نئی

چیز سے چھانے پھٹکے اور سمجھے بوجھے بغیر خواہ مخواہ کی دشمنی رکھتے ہیں اور نہ ہی وہ ان لوگوں میں ہیں جن میں نقد و انتخاب کی جرأت نہیں اور جو مغربی افکار میں محو اور مغرب کے مقلد محض ہیں اگر ایک طرف وہ علم کی خدمت کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ اس بات کو بھی محسوس کرتے ہیں کہ انسان کی تمام معنوی تگ و دو کی ضرورتوں اور تکمیل بشریت کے تمام تقاضوں کے لیے علم نہ صرف ناکافی ہے بلکہ ضرر رساں بھی ہے۔ اقبال کے پاس اس دشواری کا حل بھی موجود ہے۔ بہرحال وہ ایک ایسے شخص ہیں جو مشاہدۂ عالم کے لیے اپنا ایک مخصوص نقطۂ نظر رکھتے ہیں اور یہ نقطۂ نظر دنیا اور انسان کے بارے میں جو روحانی فلسفہ پیش کرتا ہے اس کی اور اس تمدن و تاریخ کی بنیادوں پر اپنے سماجی مکتب فکر کی اساس رکھتے ہیں جو ان کے نقطۂ نظر اور روحانی فلسفہ سے تال میل کھاتا ہے۔ اس سماجی مکتب فکر کو وہ اپنے معیار کے مطابق اور ہمارے زمانے کے انسانی سماج کے مصالح کو مدنظر رکھتے ہوئے (حضرت) علیؓ کے خطوط پر متشکل کرتے ہیں۔

یعنی کیا (حضرت) علیؓ کے خطوط پر۔ ؟ کس طرح ؟ یعنی ایک ایسا انسان جس کا دل مشرقی ہے اور دماغ مغربی۔ ایک ایسا انسان جس کی فکر صحیح اور عمیق ہے اور اس کا عشق نہایت البیلا اور پرشکوہ ایک ایسا انسان جو روح کے درد و آلام سے بھی واقف ہے اور زندگی کی گرانباریوں سے بھی۔ ایسا انسان جس کو خالق اور مخلوق دونوں کا عرفان حاصل ہے۔ ایک ایسا پارسا اور پاکباز جس کی چمک دمک میں معرفت کی روشنی اور عشق و ایمان کی سوزش دونوں کا وجود ہے۔ اس کی تیز بین نگاہوں سے غفلت و جہالت کا تیرہ و تار پردہ ایک لحظہ کے لیے بھی قوموں کی تقدیر کو نہیں چھپاتا۔ اس نے اصلاح، تہذیب اخلاق، انقلاب اور فکری تبدیلیوں کی بنیاد ڈالی ہے اسی طرح سے ایک فلسفی کی حیثیت سے اس نے اس بات کا ادراک حاصل کر لیا جس کو فرانسس بیکن بھی کہا کرتا تھا یعنی علم کی خشک آنکھ وہ آنکھ نہیں ہے جو اس دنیا میں تمام کی تمام حقیقتوں سے آشنا ہو جائے۔ اسی طرح ان کو یہ بھی احساس تھا کہ ایک عاشق صرف ریاضت، صفائے باطن اور تزکیۂ نفس کے ذریعے اپنے اصل مقام تک نہیں پہنچتا کیونکہ انسان اپنے معاشرے، زندگی اور مادہ سے بھی وابستہ ہے اور وہ اپنے آپ کو تنہائی کے خول میں محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ فرد معاشرے کے قافلے کے ہمراہ حرکت کرتا ہے اور وہ اپنے معاشرے کی راہ کے خلاف اپنی الگ راہ منتخب نہیں کر سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ ہم سب کی یہ آرزو ہے کہ اس دنیا میں جس میں کہ فکر و فلسفہ کے دوسرے تمام دبستان آج کے انسان اور مسایل کا کوئی حل پیش نہیں کر پا رہے ہیں، ہمارا بھی ایک مکتب فکر ہو جو ہماری

تمام فلسفیانہ احتیاجات کو پورا کر سکے۔ (ہم میں ایک ایسا انسان ہو) جو ایک طرف موجودہ دنیا کے تمدن و تہذیب سے بخوبی واقف ہو تو دوسری طرف ہم سے اور ہمارے گراں بہا تمدنی سرمایے سے بھی بیگانہ و ناواقف نہ ہو۔ ایک ایسا انسان جو ہمارے پورے تمدن اور تمام معنوی و مذہبی سرمایے کا محرم ہو لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ زمانے کے مقتضیات سے بھی نابلد نہ ہو اور (ذہنی طور سے) چوتھی یا پانچویں صدی میں زندگی نہ بسر کر رہا ہو۔ اسی طرح اس انسان کو ایسا ہونا چاہیے جس میں سوجھ بوجھ بھی ہو اور وہ دقیق علمی افکار کا بھی حامل ہو اور اپنی قوم کی تکالیف، وضع زندگی، قید و بند اور سختی و تنگی سے بھی غافل نہ ہو۔ ایک ایسا انسان جو ایک طرف تو انسان کی مادّی اور عینی تکالیف و مصائب کی طرف متوجہ ہو اور دوسری طرف آج کے انسانی اور خود اپنے معاشرے کی بدبختیوں پر بھی سوچ بچار کرے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ انسانی نصب العین، بشریت کے صحیح مفہوم اور تاریخ کے ادوار میں انسان کی دائمی پیامبری سے بھی غافل نہ رہے اور وہ انسانی نصب العینوں کو مادّی رنگ دے کر ان کو ان کے درجہ و مقام سے فروتر نہ کرے۔

اس وسیع اور گوناگوں پس منظر میں وہ تمام چیزیں جن کی ہم آرزو کرتے ہیں، اقبال کی شخصیت میں دیکھی جا سکتی ہیں کیونکہ اقبال کا منفرد کارنامہ ان کی وہ عظیم کامیابی ہے جو انھوں نے بیسویں صدی عیسوی کے اسلامی معاشرے میں ایک مسلمان کی حیثیت سے حاصل کی ہے۔ اقبال کو بیش قیمت قدیم و جدید سرمایے کی جو شناخت تھی اسی کو بنیاد بنا کر انھوں نے اپنے اعتقادی مکتب فکر یعنی اسلام کی نہج پر اپنے مکتب فکر کی بنیاد رکھی۔ یہی اقبال کی سب سے بڑی کامیابی ہے اور بیسوی صدی کے ہمارے معاشرے میں یہی کامیابی ان کی عظمت و بزرگی کی دلیل ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ وہ کامل شخصیت ہیں، میں یہ بھی ہرگز ہرگز نہیں کہتا کہ وہ علامتی شخصیت ہیں، نہیں، بلکہ وہ ایک ایسی شخصیت ہیں جو ایک مکمل مسلمان اور کامل اسلامی شخصیت کے تتر بتر ہونے کے بعد بیسوی صدی عیسوی میں دوبارہ نئے سرے سے متشکل ہوئی ہے۔ (اسلامی) شخصیت کی یہ تشکیل نو ہی اس کام کی ابتدا ہے اور لازمی ہے کہ ہم روشن فکر مسلمان خود اپنے آپ کی اور اپنے معاشرے کی تشکیل نو کی عظیم ترین ذمہ داری کو محسوس کریں۔ یہ سید جمال الدین تھے جنھوں نے پہلی بار صدیوں سے خواب گراں میں مبتلا ملت کو اس بات سے آگاہ کیا کہ وہ کیا تھی اور کیا ہو گئی ہے؟ سید جمال الدین کی تحریک نے ملت کی پرتی زمین میں جو بیج بویا اقبال اس کے اولین ثمر نورس تھے۔

یہ پہلا ثمر نورس ہم لوگوں کے لیے ایک عظیم بنیاد اور ایک تہلکا مچا دینے والا عظیم نمونہ ہے۔ جو مشرق، اس سرزمین، اس کی تاریخ سے وابستہ اور ایک انسان ہونے کی حیثیت سے نیچر اور مغرب دونوں

کے مدمقابل ہے۔

جیساکہ کہا جاچکا ہے اقبال مصلح ہیں؛ سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ ہے کیا؟ کیا "اصلاح" معاشرے کو تمام پریشانیوں، گرانباریوں، مصیبتوں اور بدبختیوں سے واقعی نجات دلاتی ہے؟ یا یہ ضروری ہے کہ ایک ایسا زبردست انقلاب لایا جائے جو فکر کو بھی متاثر کرے اور اجتماعی روابط کو بھی؟ جب میں اقبال کو مصلح کہتا ہوں تو وہ خواتین وحضرات جنہوں نے موجودہ زمانے کی رائج اصطلاحوں کے ذریعے تعلیم حاصل کی ہے یہ سمجھتے ہیں کہ میں اس صفت کو اُن معنوں میں استعمال کر رہا ہوں جو سیاسی سماجیات کی اصطلاح کے معنی ہیں۔ یعنی اصلاح (RELOHME) کا وہ لفظ جو لفظ انقلاب (REVOLUTION) کے بالکل برعکس اور ضد ہے جس وقت ہم اصلاح کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہماری مراد ایک تدریجی اور اوپری تبدیلی سے ہوتی ہے۔ جس وقت ہم انقلاب کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہماری مراد ایک ناگہانی دگرگونی، اندرونی ردوبدل اور تمام چیزوں کی یکسر اتھل پتھل، سے ہوتی ہے لیکن ان اصطلاحات کی روشنی میں جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اقبال مصلح ہیں تو اس اصطلاح کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ یہ لفظ آہستہ اور تدریجی تبدیلی کے معنوں میں استعمال ہو رہا ہے اور اس سے تدریجی اور ظاہری اصلاح مراد ہے۔ اس اصطلاح کو ہم لغت کے اُن عام معنوں میں استعمال کرتے ہیں جن میں تدریجی اور ظاہری تبدیلی کے ساتھ ساتھ انقلاب کے اصل معنی بھی مضمر ہیں۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اقبال مصلح ہیں یا یہ کہ وہ سید جمال الدین کے بعد ایک عظیم مصلح کی حیثیت سے دنیا سے متعارف ہوتے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ تدریجی تکمیل اور معاشرہ کی تدریجی اصلاح کے علمبردار ہیں۔ نہیں، ایسا نہیں ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایک عمیق اور دوررس انقلاب کے علمبردار ہیں۔ یہ انقلاب انداز فکر، انداز نظر، محسوس کرنے، نصب العین اور تمدن کو یکسر منقلب کر دینے سے عبارت ہے۔

اقبال، سید جمال الدین، کواکبی، محمد عبدہٗ، ابن ابراہیم، "انجمن علمای مغرب" سے منسلک مفکرین اور وہ تمام عظیم شخصیتیں جنہوں نے ان آخری سو برسوں میں سرزمین مشرق کو ہلاکر رکھ دیا، ان کی تمام اصلاحات یا بہ الفاظ دیگر ان کے اصلاحی انقلاب کی اساس اس حقیقت کے اعتراف اور اقرار پر استوار ہے اور وہ اس بات سے آگاہ ہیں کہ فرد کی اصلاح کا امکان نہیں ہے۔

یہی چند افراد کیوں؟ میں بھی اپنے طور سے غور وفکر کر سکتا ہوں اور اپنے انتخاب کردہ طریقے سے یوں زندگی بسر کر سکتا ہوں کہ اپنے معاشرے اور اپنے زمانے کا کوئی اثر قبول نہ کروں اور ایک فاسد و

منحرف معاشرہ میں اپنے آپ کو "پاک دل و پاک باز" بنائے رکھوں۔ اگر فرد کے لیے اپنے معاشرے میں اس طرح کی زندگی گذارنے کا امکان نہ ہوتا تو پھر انسانی ذمہ داری کے کوئی معنی نہ ہوتے لیکن میں اسی کے ساتھ ساتھ اس نوع کی اصلاح کو رد کرتا ہوں اور یہ سوال کرتا ہوں کہ اس بات کا کیسے امکان ہے کہ انسان ایک ماحول میں زندگی بسر کرے اور اس ماحول کے اثرات کو قبول بھی نہ کرے۔

ماحول یعنی عوامل و علل کا وہ مجموعہ جس کو تاریخ، عالم طبیعی، معاشرہ، افراد کے ارتباط باہمی اور ان کی خاندانی و توریثی خصوصیات، سب ہی مل کر بناتے ہیں اور وہ فرد کے "درون" و "برون" دونوں ہی کو اپنے اندر جذب کر کے اس کی ساخت و پرداخت کرتا ہے اور فرد کو فرد بناتا ہے، اگرچہ یہ ممکن ہے کہ فرد بھی ماحول پر اثر انداز ہو سکے لیکن فرد کا ماحول کو اس طرح متاثر کرنا، اس کی قوت ارادہ، ارفع و اعلیٰ خود شناسی و خود آگہی، تکنیکی اور علمی فعالیت سے وابستہ ہے۔

انیسویں صدی عیسوی سے عمرانیات کی دنیا میں یہ مسئلہ زیر غور ہے کہ فرد کو معاشرے پر تقدم حاصل ہے یا معاشرے کو فرد پر؟ اس سلسلے میں میں اپنا ایک مخصوص نقطۂ نظر رکھتا ہوں۔

انیسویں صدی کے بہت سے انفرادیت پسند (INDIVIDUALISTS) اور بہت سے اصلاحات اساسی کے علم برداروں (RADICALISTS) اور انسان دوستی کے حامیوں (HUMANISTS) کا خیال تھا کہ "فرد" افراد کی فکر و ارادہ کا نام ہے جو معاشرے کی تکمیل کرتے ہیں اور تاریخ کو راہ پر لگاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ سوشلسٹ، نوحقیقت پسند اور مادہ پرست مفکرین زیادہ تر ڈارون کے اس نظریہ کے زیر اثر جو علوم انسانی کی اساس بن گیا تھا، (حتیٰ کہ تاریخ، ادب اور آرٹ کی مختلف اقسام کا بھی اساس قرار دیا گیا تھا) انسان کو دیگر مخلوقات سے ممتاز و متمائز نہیں سمجھتے تھے اور جس طرح سے کہ نباتات و حیوانات اپنے ماحول کے جبر کے آفریدہ و پرداختہ ہوتے ہیں انسان کو بھی اسی طرح اپنے اجتماعی جبری ماحول کا زائیدہ و پروردہ اور ان کے عینی و خارجی قوانین کا ساختہ و پرداختہ سمجھتے تھے جو تاریخ اور معاشرے کو گردش میں رکھتے ہیں۔

آج فرد یا معاشرہ کا مسئلہ ایک نئے مبحث کا عنوان بن کر علم نفسیات اور عمرانیات کی شکل میں سامنے آیا ہے اور ان دونوں علوم کے درمیان سخت اختلاف کا باعث بنا ہوا ہے۔ فرد و معاشرے کی یہ جنگ ہمارے ان نیم روشن فکر مفکروں کو شدت سے اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے جو فکری اور علمی لحاظ سے ابھی دوسروں سے سو سال پیچھے ہیں۔

میں اس سلسلے میں اپنے استاد محترم گورویچ کے نظریہ کا قایل ہوں وہ انسانی اور اجتماعی مسایل

کے سلسلے میں "وحدت علت" اور عامل تام وواحد (ایک مکمل اور اکیلا عامل) کے نظریے کے مخالف تھے اور کہا کرتے تھے کہ انسانی مسایل اس سلسلۂ علت و معلول کے مسایل سے زیادہ پیچیدہ ہیں جن کا ایک طرح سے تحلیل و تجزیہ کیا جا سکتا ہے وہ تعدد عوامل کے قایل تھے ان کے نزدیک ایک اجتماعی مظہر (PHENOMENE SOCIAL) : قوعۂ اجتماعی (FAITSOCIAL) کئی اور عوامل مثلاً اجتماعی، تاریخی، تمدنی، معاشی اور طبیعی عوامل کا ساختہ و پرداختہ ہوتا ہے۔ ان تمام عوامل کا تحلیل و تجزیہ بھی اتنا سہل نہیں ہے کہ دوسرے علوم طبیعی کے انداز و روش پر انسانی اور سماجی مسایل کی تسہیل کی جائے جس کے نتیجے میں یہ (علوم طبیعی) ان عوامل کو مسخ اور ان میں تحریف کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔

یہ عمل (تسہیل مسایل) عام روشن فکروں کے لیے جس قدر جاذب نظر، ہنگامہ خیز اور قابل تقلید ہے، عمرانیات کے لیے اتنا ہی پریشانی کا باعث ہے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ عمل کسی مکتب فکر کی ترویج و تبلیغ کے لیے تو بہت اچھا ہے لیکن علمی تحقیق و تحلیل کے لیے بہت ہی نقصان دہ ہے۔ اس کے علاوہ علم نفسیات یا عمرانیات کے درمیان علیت کا جو رابطہ ہے وہ یک طرفہ نہیں بلکہ دو طرفہ ہے۔ (کیونکہ) فرد کا وجدان اور اجتماعی وجدان دونوں ایک دوسرے کے مدمقابل اپنا اپنا جداگانہ وجود رکھتے ہیں اور ہمیشہ ایک دوسرے کو متاثر بھی کرتے ہیں اور ایک دوسرے کا اثر بھی قبول کرتے رہتے ہیں۔

علت و معلول اور معلول و علت کا یہ تعلق اپنی جگہ قائم رہتا ہے یعنی ایک علت، علت ہونے کے ساتھ ساتھ معلول بھی بن جاتی ہے اور ایک معلول، معلول ہونے کے ساتھ ساتھ علت بھی۔

اس وجہ سے اس بحث کو کہ فرد، معاشرہ کی تخلیق کرتا ہے یا معاشرہ فرد کی؟ یہ شکل دینی چاہیے کہ فرد اور معاشرہ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کی تخلیق و تزئین کیا کرتے ہیں۔

میں نے اس مسئلہ پر جو کچھ غور و فکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں ایک تیسرا عامل بھی موجود ہے جس کو لوگوں نے بھلا دیا ہے اور وہ عامل فرد کا ارتقا اور اس کی تدریجی تکمیل ہے۔

لوگوں نے فرد انسانی کو ایک "حقیقت ثابتہ" کی حیثیت سے مدنظر رکھا ہے اور اس سلسلے میں گورویچ، انفرادیت پسند، علمائے نفسیات و تاریخ و علوم طبیعی و عمرانیات باہم دگر متفق اللسان ہیں۔

جس وقت ہم فرد کا لفظ استعمال کرتے ہیں اس سے ہماری مراد "شخص" نہیں "شخصیت" ہوتی ہے اور یہاں فرد یا شخصیت سے مراد وہ انسانی فردی ارادہ ہے جو معاشرہ یا نیچر یا تاریخ یا توارث (HERIDITY) کے ارادے کے بالمقابل (اپنے مستقل وجود کا حامل) ہے اس سے مراد وہ راہ عمل بھی

ہے جو (فرد یا شخصیت) اپنے عزم راسخ اور قوت ایجاد کے ذریعے معاشرہ میں اختیار کرتا ہے اور اسی کے ذریعے معاشرے پر اثر انداز ہوتا ہے (اس سے مراد فرد یا شخصیت کی) وہ قوت و طاقت بھی ہے جو اپنی دل خواہ چیزوں کو آشکار کرنے یا ان میں تغیر و تبدل کر دینے کی نشان دہی کرتی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ تاریخ کے مختلف ادوار، مختلف معاشروں اور اجتماعی، تمدنی اور معاشرتی ارتقاء و تکمیل کے مختلف مرحلوں میں یہ "ارادہ" بدلتا رہتا ہے۔

ایک قبائلی یا اولین معاشرے میں فرد کا کوئی وجود نہیں ہوتا، یہ معاشرہ اور اجتماعی روح ہی ہے جو اپنے مقتضیات کے مطابق اس کو پیدا کرتی اور پروان چڑھاتی ہے۔

جس انداز سے تاریخ آگے بڑھتی ہے تہذیب و تمدن کا ارتقا ہوتا ہے، علم و عرفان اور تکنیک کی تکمیل ہوتی ہے اسی لحاظ سے فرد خود آگاہی کی منزل پر پہنچتا ہے (اس منزل پر آکر) وہ شناخت کر سکتا ہے، غور و فکر کر سکتا ہے، تحلیل و تجزیہ کر سکتا ہے اور پھر کسی حتمی فیصلے تک پہنچ سکتا ہے (اسی منزل پر آکر) اس میں تنقیدی روح بھی پیدا ہوتی ہے، جب وہ علوم اور تکنیک سے آراستہ ہو جاتا ہے تو وہ چیزوں میں تغیر و تبدل کرنے، ان کو مکمل کرنے، اصلاح کرنے، تباہ و برباد کرنے یا بنانے میں مشغول ہوتا ہے انسان اور نیچر کے درمیان جو رابطہ ہے اس میں ہم اسی اصول کو کارفرما پاتے ہیں۔

اسی لیے قبل اس کے کہ ہم اس سوال کا جواب دیں کہ فرد معاشرے کو بناتا ہے یا معاشرہ فرد کو، علم نفسیات اصل چیز ہے یا عمرانیات؟ ہمیں یہ سوال اٹھانا چاہیے کہ معاشرے کے تہذیبی و تمدنی ارتقا کے کس مرحلے پر ایسا ہوتا ہے اور کس فرد کے ذریعے یہ باتیں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

آج کا انسان انتقادی روح کا حامل ہے اور وہ حکومت، مذہب، زندگی اور اجتماعی روایات کو بدل سکتا ہے، ان سے بغاوت کر سکتا ہے اور دوسری چیزوں کو اپنا سکتا ہے لیکن ایک خود ساختہ و پرداختہ قبیلہ کا فرد ان عوامل سے ناآگاہ ہوتا ہے یہ عوامل اس کے لیے تقدیس اور وحی منزل کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کی حیثیت ابدی و ازلی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ڈورکھیم کے نظریے کی تائید کرتا ہوں۔ اس کا نظریہ ہے کہ تاریخ جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے اور تمدن، عالم تکمیل میں پہنچتا ہے، اجتماعیت (روح اجتماعی کی مطلق فوقیت) کمزور ہو جاتی ہے اور انفرادیت (فردی خود آگاہی اور اجتماعی روح سے فرد کی آزادی) ترقی پاتی ہے۔ اس حقیقت کو ہم آج کے متمدن یورپی معاشرے اور وہاں کے اصل قبائلی باشندوں کے معاشرے کا باہم موازنہ و مقابلہ کر کے دیکھ سکتے ہیں۔ ان قبائلی باشندوں کی مثال عہد جاہلی کے ان عربوں جیسی ہے جو ایک ایک فرد کی حیثیت سے نہیں بلکہ پورے پورے قبیلے کی حیثیت سے مشرف بہ اسلام

ہوئے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ فرد جس حد تک اپنی ترقی وارتقا، تمدن اور خود شناسی کا حامل ہوگا اس حد تک اس میں قوت و طاقت ہوگی اور ہے۔ ماحول کو بدلنے، اس کی اصلاح کرنے یا اس میں اجتماعی انقلاب پیدا کرنے کی صلاحیت کا امکان بھی ہوگا اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے فرد کی مسؤلیت (ذمہ داری) اور تعہد (COMMITMENT) کا مسئلہ شد و مد کے ساتھ زیر بحث آتا ہے۔

اس وجہ سے یہ سوال کہ بہترین اور صالح فرد کو تربیت دینی چاہیے یا بہتر اور صالح معاشرہ بنانا چاہیے، بے معنی ہوجاتا ہے کیونکہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ صرف اجتماعی مبارزہ ہی وہ چیز ہے جس کی بدولت انسان کی فطری اور حقیقی نمود ترقی پذیر ہوتی ہے۔ گوشۂ تنہائی میں فلسفیوں، شاعروں، زاہدوں اور عابدوں کو تو جنم دیا جاسکتا ہے لیکن مسلمان کو نہیں کیونکہ مسلمان کی تخلیق تو ایمان و جہاد اور صرف ایمان و جہاد ہی سے ہوتی ہے۔

پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جدوجہد دو مرحلوں میں منقسم ہے۔ فرد سازی کا مرحلہ (مکہ کے تیرہ سال) اور معاشرہ سازی کا مرحلہ (مدینہ کے دس سال)

لیکن ہم مکہ کی فرد سازی کے مرحلے میں دیکھتے ہیں کہ آپ کس طرح افراد سازی فرماتے ہیں۔ فرد، معاشرے کے قافلے میں اپنی زندگی بسر کرتا ہے اور اسی قافلے کے تاریخی حلقۂ عمل میں حرکت پذیر ہوتا ہے۔

اگر وہ (فرد) کسی گوشے میں بیٹھ رہنے، دوسروں سے کٹ جانے اور میر قافلہ یا قافلہ کے نمائندوں اور راستہ کے واقف کاروں سے کوئی سروکار نہ رکھنے کے باعث یہ خیال کرتا ہے کہ اس نے قافلہ والوں سے الگ اپنی منزل کا انتخاب کرلیا ہے تو وہ اپنے آپ کو فریب دیتا ہے کیونکہ وہ ٹھیک اسی جادہ اور انہی منازل کی راہ پیمائی کرتا ہے جس پر قافلہ گامزن ہوتا ہے اور آخر کار وہ اسی منزل مقصود پر پہنچے گا جس پر کارواں پہنچتا ہے۔

جب زمانہ خراب ہو، اجتماعی روابط فاسد ہوں، معاشرہ کا تمدن اور انداز تربیت گدلا گیا ہو۔ روحانی، سیاسی اور معاشی حرکت کا دائرۂ عمل رُو بہ فساد ہو (ایسے وقت میں) اس کا امکان نہیں کہ ہم میں صالح انسان موجود ہوں۔ ایسی چیز کا وقوع پذیر ہونا ممکن نہیں ہے۔

اگر کوئی فرد خود کو سیل وقت سے بچا سکے اور پوری جماعت کے لُٹ جانے کے باوجود اپنی آزادی برقرار رکھنے میں کامیاب ہوجائے اور واقعتاً اپنے آپ کو اس طرح بچالے جائے کہ نہ تو اس کا

دامن آلودہ ہو اور نہ وہ کسی لغزش کا مرتکب ہوا ہو تو ایسا شخص بھی ایک بہت بڑی خیانت کا ارتکاب کرتا ہے، کیونکہ اس کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ وہ دوسرے افراد اور معاشرے کی اصلاح کرتا لیکن وہ یہ فریضہ انجام نہیں دے پایا (کوئی بھی فرد) دوسروں کے ساتھ خیانت کرکے اپنی خدمت نہیں کرسکتا۔

جو شخص اپنی ہوشیاری اور تلاش وجستجو کے ذریعہ اس قید خانہ سے نکل بھاگتا ہے جس میں وہ اپنے اعزا اور اقربا، ہم فکر وہمدرد اور آزادی کے متوالوں کے ساتھ قید ہے تو وہ اپنی انفرادی آزادی تو حاصل کرلیتا ہے مگر وہ ہرگز ہرگز جوانمرد اصیل ونجیب انسان نہیں ہے بلکہ ایک ہیچ مطلب پرست اور بے وقعت راحت طلب آدمی ہے اور اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی آزادی پر فخر کرے۔ ایسے شخص کی تو بات ہی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ یہ آزادی نہیں بلکہ ننگ[1] ہے۔

میرے خیال میں اسلام نے جو سب سے بڑا انقلابی عمل کیا ہے، انسان کو اسلام کی جو سب سے بڑی دین ہے اور اس نے انسانی تاریخ وتمدن (صرف مسلمانوں کی تاریخ وتمدن) کی جو عظیم ترین خدمت انجام دی ہے وہ یہ ہے کہ انسان کے اندر مذہبی عشق کی جو قوت اور خداشناسی کی جو معجزنما روحانی طاقت پوشیدہ تھی، جس کی بدولت وہ انقلاب، جانبازی، موت، شہادت اور معبود ومعبد کی راہ میں اپنے آپ اور اپنی اولاد کو قربان کردینے پر آمادہ رہتا تھا (اسلام نے اسی پوشیدہ و باطنی طاقت کو) انسانی معاشرہ سازی، عدل وانصاف کے قیام، استقرارِ حکومت اور مادی ومعنوی زندگی کی پیشرفت میں لگادیا۔

یہی وجہ ہے کہ تاریخ مذاہب میں ہم دیکھتے ہیں کہ مذہبی تعصب، خدا کی خوشنودی، عبادت گاہوں، بتوں اور مذہبی آثار کو بچانے کی خاطر چینیوں، ہندیوں، یہودیوں، اور عیسائیوں نے کس قتل و

---

[1] اس صفحہ پر یہ نامکمل حاشیہ بھی درج ہے مگر متن کی کسی سطر پر علامت حاشیہ نہیں ہے۔ (مترجم) ——— "میرے خیال میں قرآن میں جن مستضعفین کا ذکر ہوا ہے اور جن کے انحراف کی ذمہ داری قرآن نے مذہبی پیشواؤں اور روحانی افراد کی گردنوں میں ڈالی ہے، وہ یہی لوگ ہیں۔ جگہ جگہ پر پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) حکم دیتے ہیں کہ "قریش کے سرداروں اور جگر گوشوں کو مار ڈالیں" آپؐ نے ملتوں کے سرداروں کو جو خط ارسال فرمایا اس میں تصریح کردی ہے کہ اگر تم (اسلام) قبول نہیں کرتے تو پوری ملت کے گناہ کا بار تمہاری گردن پر ہوگا۔ میں (شریعتی) جمہوریت کو حکومت کی ترقی یافتہ ترین اور اسلامی ترین شکل سمجھتا ہوں لیکن کسی قبائلی معاشرے میں جمہوریت کے قیام کو ناممکن سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ "ایک متعہد انقلابی کی رہبری" میں ایک معتدبہ عرصہ گذر جانے کے بعد متمدن جمہوری معاشرے کی بنیاد ڈالنی چاہیے اور اس کے بعد . . .

غارت گری، آتش زنی اور اجتماعی ہولناکیوں کو روا رکھا ہے لیکن سب کے سب جنگ ہفتاد و دو ملت کی خاطر "پوچ راہوں میں پاک موت" کی نیند سو گئے۔ البتہ صرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ تنہا شخصیت ہیں جن کے غزوات میں اپنے اور پرائے مرنے والوں کی تعداد دو ہزار سے بھی کم ہے اس کے باوجود وہ اس بات پر قادر ہو سکے کہ نہ صرف انسانی تاریخ کے دھارے کو موڑ دیں بلکہ ایک خارق العادت انقلابی جست کے ذریعے اس معاشرے کو جو کہ بدوی، قبائلی، خیمہ نشینی، حتیٰ کہ ماقبل تاریخ کا معاشرہ تھا ایک ترقی پذیر، بین الاقوامی نظریات کا حامل، بالکل نیا اور راہِ ارتقا پر گامزن ایسے معاشرے میں بدل دیا جس کی مدنیت اور تمدن پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہو۔

یہ تمام ویران کر دینے والی اور انقلابی قوتیں، جن کا گذشتہ تاریخ میں کوئی نام و نشان نہیں ملتا، یک بیک کہاں سے موج زن ہو گئیں؟

میرے خیال میں اس جوش و خروش کی ابتدا وہاں سے ہوئی جبکہ مذہب کی معنوی اور روحانی خارق العادت قوتِ انسان کی معاشرتی زندگی کے دائرہ عمل میں مستحکم ہوئی اور (یہ طاقت و قوت) روح کے باطن، عبادت گاہوں کے تاریک اور بے جان گوشوں، مندروں اور صومعہ سے نکل کر کوچہ و بازار میں آگئی اور وہ تمام قوتیں، صلح و آشتی کا وہ جذبہ جو صرف اخروی دنیا میں گھر بنانے کے لیے صرف ہوتا تھا وہ مضبوط و مستحکم معاشرہ، مدنیت اور دنیاوی ساز و سامان فراہم کرنے کی کوششوں میں صرف ہونے لگا۔ ان تمام مذاہب کے معتقدین بتوں کے قدموں یا عبادت گاہوں کی محرابوں میں اس لیے قربانی کیا کرتے تھے کہ اس طرح سے وہ تزکیۂ نفس حاصل کر سکیں اور خبیث روحوں اور شیطانوں کو بھگا سکیں اور ان کے اندر اہورائی طاقتیں بھی آ سکیں۔ مسلمانوں نے ان جانبازیوں کے جذبات کو اجتماعیت، جنگ اور فکر کی وسیع و عریض سرزمین میں پھیلا دیا (جس کے مظاہر یہ ہیں کہ) انہوں نے اپنے مسلک اور معاشرہ پر ایمان کی قوت (کی وجہ) سے ظلم و استبداد اور مذہبی و سیاسی خرافات پردازیوں سے جنگ کی۔ جاہلی روایات کا قلع قمع کیا، اگلے وقتوں کی نسلی، حکومتی اور خاندانی تفاخر کا انہدام کیا اور پھر قیصروں اور ملوکوں کے محلوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، آگ اور انسانیت دشمن جھوٹے آتش کدوں کو سرد کر دیا، شرف و ترجیح کے بتوں اور طبقاتی، قبائلی اور ملی تضادات کو تہس نہس کر دیا، انسانوں کی ایک معتد بہ تعداد کو (اپنے جیسے انسانوں کی) غلامی سے نجات دلائی اور ان کی فکر کو حریت، برابری اور حاکمانہ عزت کی بلندیوں تک پہنچا دیا، دنیا کو ہڑپ کرنے والے بادشاہوں، اشرافیہ اور پروہتی طبقہ کو ملیامیٹ کر دیا، ملتوں کی حکومتوں کے ظلم و ستم سے رہائی دلائی اور انسان کی نئی قدر و قیمت متعین کی۔ آخر کار معاشرہ سے

لڑتے بھڑتے ہوئے انھوں نے انسانی زندگی، صرف مادی زندگی نہیں، کی اصلاح کی اور ایک ایسے معاشرہ کی بنیاد ڈالنے کے مرحلے تک پہنچے جو سیاسی اور اقتصادی حیثیت سے مستحکم اور معنوی، تمدنی اور اخلاقی دولت سے مالامال، اور اس دنیا کے لیے نافع ہو۔ یہی نہیں بلکہ اسی کے ساتھ ساتھ (مسلمانوں نے) فردکی حیثیت سے بھی نظریاتی کشاکش وکشمکش کے درمیان اس معاشرہ سازی کے دشوار ومشکل پیغام کو پہنچاتے ہوئے نشوو ارتقا بھی حاصل کی اور تقویٰ، تزکیہ نفس، اصلاح، پاکیزگیٔ احساس، استغنا، صبراور فضیلت (کی دولت) سے بھی بہرہ مند ہوئے۔

انسان کی معاشرتی اور معنوی زندگی کی تاریخ میں غالباً اسلام کا اہم ترین انقلاب یہ ہے کہ اس نے مذہب کی عظیم قوت کا رُخ پھیر دیا۔ یعنی وہ تمام قوتیں، تمام خون اور وہ سارا وقت اور زیب و زینت کا وہ سارا ساز و سامان جو خانقاہوں، مندروں اور بت خانوں میں برباد وضایع ہوتا تھا (اب) انسانی معاشرہ کی تکمیل، استثمار (دوسروں کی محنت کا فائدہ حاصل کرنا اور ان کو کچھ نہ دینا)، جہل، ظلم اور استبداد کے قلعوں اور حصاروں کی نابودی، عدل و انصاف کی روح کو تقویت دینے، علم وتمدن کو ارتقا پذیر کرنے، اور انسانی زندگی کی تمام جہتوں کو گمراہیوں سے نکال لینے کی سمت میں حرکت کرنے لگا۔

"فرد کی اصلاح"، "تزکیۂ نفس"، "تکمیل اخلاق، حصول تقویٰ اور "خود اصلاحی" کا یہی اور صرف یہی راستہ ہے۔

عوام کی سرنوشت سے غافل ہوکر، اپنی معاشرتی ذمہ داریوں کو فراموش کرکے، معاشرہ سے الگ کسی گوشۂ تنہائی و عزلت میں تقویٰ، تزکیۂ نفس اور "اصلاح فرد" کا حصول ممکن نہیں ہے۔ اسلام میں بھی ایسا نہیں ہے۔ ہمارے وہ افراد جو اسلامی تربیت کے مظہر تھے اور وہ افکار و آرا اور مکاتب فکر جو آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ ہماری تاریخ میں اس طرح کی بات ہرگز ہرگز نہیں رہی ہے۔

پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گرد جو افراد تھے ان میں سے کسی ایک کو بھی ہم (صرف) عبادت گاہ میں فروکش ایک عابد یا گوشہ گیر صحابی کی حیثیت سے نہیں جانتے۔ حتیٰ کہ وہ اصحاب صفہ بھی جن سے ہمارے زہاد اور متصوفین اپنا سلسلہ ملاتے ہیں وہ بھی ہاتھوں میں تلوار لیے، اپنے فرض کی ادائگی اور جہاد کے لیے ہمہ وقت آمادہ رہتے تھے، ان لوگوں نے اپنے اپنے دلوں کو اپنے گھروں اور شخصی زندگیوں کی طرف سے پھیر لیا تھا لیکن (ان کا یہ عمل اس لیے نہیں تھا کہ) وہ اپنی ذات کو عبادت گاہوں کے گوشوں، پہاڑوں کے غاروں، رہبانیت اور زہد پرستی کی درگاہوں کی چوکھٹوں کو چومنے میں ضایع و برباد کریں بلکہ اس کے

بالکل برعکس صرف اس لیے کہ اپنے پورے وجود اور زندگی کے ایک ایک لمحے کو اجتماعی کاموں اور اعتقادی جنگوں میں صرف کریں۔ ان استثنائی لوگوں نے اپنی فردی زندگی کو اجتماعی اور فکری جنگ و پیکار کے لیے وقف کر دیا تھا۔

چونکہ (یہ خصوصیت) اسلامی بصیرت کی بدیہیات، اسلام کا ایک مُسَلَّم اصول اور مذہب اسلام کے عقیدہ کا ایک جزو ہے اس لیے بیسویں صدی عیسوی کے ہمارے تمام مسلمان مصلحین اسی فکری خصوصیت کے حامل تھے۔ در اصل یہی جہت (سفر) یہی سجدہ ریزیاں اور یہی رفتار و طریق اسلامی روح کا عام میلان اس کی کُلّی بصیرت اور مکتب (فکر) ہے۔

حتیٰ کہ وہ دشمنان اسلام جو ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو "پیغمبر مسلح" اور اسلام کو "مذہب شمشیر" کہتے ہیں وہ بھی ایک طرح سے اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اسلام ایک اجتماعی مذہب ہے ورنہ کلاسیکی معانی کے مطابق متصوفانہ احساسات، تزکیۂ نفس، فردکی اصلاح کی کوشش اور دینی تقویٰ (کے حصول) کے لیے تلوار کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ایسے کام (تزکیۂ نفس، فردکی اصلاح، تقویٰ وغیرہ) ہر عہد اور ہر طرح کے حالات میں انجام دیے جاسکتے ہیں۔ استبداد، استثمار، ظلم، غصب اور مجرمانہ افعال نہ صرف یہ کہ ان کاموں کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ یہ (مجرمانہ افعال) تمہارے لیے اس بات کا مناسب و موزوں موقع بھی فراہم کرتے ہیں (کہ تم تزکیۂ نفس، تقویٰ وغیرہ حاصل کرتے رہو) تاکہ تم کسی گوشہ میں چلے جاؤ اور ان مجرمانہ افعال اور عوام کی سرنوشت سے کوئی سروکار نہ رکھو بلکہ اپنے نفس سے نبرد آزمار ہو۔ (یہ مجرمانہ افعال) نفس سے اس جنگ میں تمہاری مدد بھی کرتے ہیں۔

اسلام میں، فرد معاشرہ کی اصلاح کے لیے لڑنے کے دوران اپنے ناکام ہونے کے باوجود اصلاحِ فرد اور اصلاحِ اخلاق (کے مرحلے) تک پہنچتا ہے۔ اسی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ ایک بگڑے ہوئے معاشرہ میں بھی ایک صالح فرد کا وجود ممکن ہے یعنی صالح فرد بنائے جاسکتے ہیں، یہیں سے فرد کی ذمہ داری کا آغاز ہوتا ہے مگر اس شرط کے ساتھ۔

ایک خود آگاہ فرد کی ذمہ داری مخلوقات سے (وابستہ) ہے اور (اس کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ) انحراف کرنے والے، غیر صحت مند، حقیقت، سلامتی اور ترقی کے دشمن عوامل سے جنگ کرے (امر بالمعروف نہی عن المنکر کے یہی (حقیقی) معنی ہیں (وہ بے جان اور نفرت انگیز معنی نہیں جو آج کے رائج معنی ہیں)۔

عام انسانوں کے طرز و رفتار، سرنوشت اور خیالات کے لیے ایک مسلمان فرد خدا کے سامنے جواب دہ ہے اور (اس جواب دہی کا اس نے) عہد بھی کیا ہے۔ (اُس کی یہ ذمہ داری) فکری عملی اور معاشرتی (ہر میدان عمل پر محیط ہے)۔ یہی امر بالمعروف نہی عن المنکر کا اصل مفہوم ہے جو آج کے مضحکہ خیز معنوں میں ڈھل گیا ہے امر بالمعروف نہی عن المنکر کے یہی اصل معانی آج کی بیدار مغربی دنیا اور روشن فکر افراد کے سامنے "انسان، روشن فکر، دانش مند و ہنرمند افراد کی ذمہ داری اور (ان کی) ذمہ داری کا مسئلہ" کے عنوان سے زیر بحث ہے، (مغرب کی بیدار دنیا کے سامنے یہ مسئلہ) خشک، بے توجیہ، بے سر و پا، طفلانہ نصیحتوں کی حیثیت سے زیر بحث نہیں ہے، نہ ہی (اس مسئلہ کا دائرہ کار) انفرادی اعمال، معاشرتی روابط اور فرد کی زندگی کے تنگ و محدود دائرہ میں محصور ہے کہ اگر ہم (امر بالمعروف نہی عن المنکر کے ان معنوں پر) از سر نو دھیان بھی دیں تو وہ نہ تو ہمارے کسی کام کا ہے اور نہ ہی اس میں کوئی معنی ہیں، نہ مقدمۂ علمی ہے نہ ہی تاثیر ہے اور نہ قابل قبول اور ہم کو ایسی نصیحتیں قبول کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

اچھائیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا، بچوں کو دادامیاں کی نصیحت نہیں ہے نہ ہی یہ مقدس افراد کا غیر مقدس لوگوں کو، داڑھی، مونچھ، طہارت، نجاست، شکیات، پیچیدہ سوالات، قرأت اور تجوید کی مختصر یادداشتوں، لباس پہننے اور چلنے پھرنے کے آداب کے متعلق مشوروں سے نوازنا ہے۔

امر بالمعروف نہی عن المنکر کے معنی یہ ہیں کہ فرد جس اعتقادی مسلک سے منسلک ہے اس کا پیغام اپنے معاشرہ تک پہنچائے۔ یہ وہی ذمہ داری ہے جو روشن فکر، کسی مسلک کے ماننے والے، کسی نظریہ پر اعتقاد رکھنے والے، کسی پارٹی سے منسلک فرد اور کسی ایسے انسان پر عائد ہوتی ہے جو ایک پچھڑے ہوئے، استعمار کے کچلے ہوئے معاشرہ سے وابستہ اور ایسے طبقہ کا فرد ہو جو خود تو محروم ہے مگر اس کی محنت کا فائدہ دوسرے اٹھاتے ہیں۔ یہ ذمہ داری ایک مفکر، فلسفی، ادیب، دانش مند اور ایسے صاحب ہنر کی ذمہ داری کے مانند ہے جو آج کی دنیا اور آج کے انسان سے وابستہ ہے۔

افسوس ہے کہ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں بیسویں صدی عیسوی کے ایک ایک مصلح کے بارے میں کچھ عرض کروں اگر میں یہ چاہوں کہ ان تمام لوگوں کے فرداً فرداً نام لوں اور ان کا ذکر کرتے ہوئے ان کے زمانے، ان کے باقیات اور کوائف زندگانی کی طرف صرف اشارے کرنے

پر اکتفا کروں تو یہ بات بھی کافی نہ ہوگی۔ لیکن (یہ ممکن ہے کہ) وہ اصول یا وہ مبادیات جن پر تحریک بیداری یا نشاۃ ثانیہ یعنی "تجدید تولد اسلام" کی بنا استوار ہے آپ کے سامنے پیش کروں تاکہ روشن فکر افراد اور عام مسلمان کم از کم اصلی کُلّی خصوصیات اور سمتِ سفر کو محسوس کر سکیں۔

رنَ انس (RENAISSANCE) کا لفظ (اپنے اصل معنوں میں) اس تحریک (تجدید تولد اسلام) کے لیے ایک بہت پُر معنی لفظ ہے اور اس تحریک کے رہبروں اور پیرووں نے اس کی جو روح اور جو معنی محسوس کیے ہیں وہ اسی تحریک کے لیے مناسب ترین لفظ ہے نہ کہ اُس تحریک کے لیے جو پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں یورپ میں قرونِ وسطائی افکار و اعمال کی مخالفت میں چلائی گئی تھی۔ کیونکہ ہم اس بات کے قایل ہیں اور تاریخ بھی ہماری اس بات کی صراحت کے ساتھ تصدیق کرتی ہے کہ اگر ہمارے معاشرہ کی تشکیل جدید ہوتی ہے تو ہمارا یہ بے جان اسلامی معاشرہ اپنی اولین تولید کی طرح درخشاں، بارآور، مستحکم اور ترقی کے جادہ پر گامزن معاشرہ ہو جائے گا۔

تاریخ اسلام کے اولین تولد کا کیا نقشہ پیش کرتی ہے؟ کس طرح اس کی قدر و قیمت کا تعیین کرتی ہے؟ تاریخ یہ نہیں کہتی کہ جب پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ولادت ہوئی تو کتابخانوں کی تعداد زیادہ ہو گئی، عرفان و آگہی نے چمکنا دمکنا شروع کر دیا، خدائے عشق رقص کرنے لگا اور خدائے علم جوش و خروش سے معمور ہو گیا، سیارہ مریخ جو خدائے جنگ ہے، کانپنے لگا، ہرقل کے ہاتھوں سے تیر و کمان گر گئے، آسمان سے نور کی بارش ہونے لگی اور زمین متزلزل ہو گئی۔

نہیں، بلکہ (تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ) فارس کا آتش کدہ اور تمام جھوٹی آگ سرد ہو گئی۔ آگ اور جھوٹی! کیوں؟

اس لیے کہ یہ تمام آگ اہورا مزدا کی آگ نہ تھی، اہورا مزدا کی آگ ایک اور صرف ایک ہے یہ آگ تین تھی۔ آذر بائجان میں آتش گشتاسپ تھی جو طبقۂ اشراف کی ملکیت تھی۔ آتش برزین مہر میں دہقانوں کی اور شہر استخر میں آتش فارس ان زرتشتی علما اور عرفا کی ملکیت تھی جو ظلم و ستم ڈھانے والے حکمران طبقہ کی جماعت کا ایک جزو تھے۔

یہ آگ ہر آگ سے بدتر، جھوٹ، فریب اور جادوگری کی آگ تھی۔ یہ آگ مکر و حیلہ، فکر سے انحراف اور مذہب کے نام پر عوام کو (ذہنی) افیون دینے کی آگ تھی۔ یہ آگ استبداد، استثمار اور احمق بنانے کی آگ تھی جس کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ یہ چیزوں کو جلا ڈالنے اور ان کو راکھ کر ڈالنے کی سب سے زیادہ موثر آگ ہے؟ یہ آگ سرد ہو گئی، ختم ہو گئی وہ تمام آگ جس میں ہمیشہ عوام اہورا مزدا

کے نام پر اہرمن کے فائدے کے لیے جلا کرتے تھے، سرد ہو کر ختم ہو گئی۔

"اور ساسانیوں کے محل کے کنگورے زمین پر ڈھے گئے" یہ بات ایک بہت ہی پرمعنی چیز کو سامنے لاتی ہے یعنی ایک نئی روح، جدید عرفان اور نیا وجدان پیدا ہوا جو (اس نئے) مذہب کے سانچے میں ڈھل گیا لیکن یہ نیا مذہب تمام رائج مذاہب کے برعکس و برخلاف ہے (کیونکہ) یہ ہر اس اینٹ سے سروکار رکھتا ہے جس کی بنیاد ٹیڑھی ڈالی گئی ہے اور ان تمام در و دیوار اور ستونوں سے بھی سروکار رکھتا ہے جو ظلم و ستم کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔

یعنی پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ظہور اس لیے نہیں ہوا کہ وہ زرتشت، مانی، مزدک اور کنفیوشس کی طرح اپنے آپ کو (ظلم و ستم کرنے والے) حکمراں طبقہ تک پہنچا دیں اور اس طبقہ کے دربار میں شاعر، دبیر یا استحقاق یافتہ افراد کی صف میں بیٹھیں (بلکہ) وہ اس لیے تشریف لائے ہیں کہ ان چیزوں کو نیست و نابود کر دیں۔

"جب پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) اس دنیا میں تشریف لائے تو فارس کا آتشکدہ سرد ہو گیا اور مداین کے قلعہ کے کنگورے زمین کے برابر ہو گئے"، (یہ جملہ) اس دنیا اور اس معاشرہ میں اسلام کی ذمہ داری اور اس کی کیفیت نگاہ کو بیان کرتا ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان روشن فکروں کی ایک جماعت جس کی خواہش یہ ہے کہ اسلام کی تشریح، توضیح اور تعبیر آج کی زبان میں اس طرح اور ان افکار کے ساتھ کریں جن کو موجودہ زمانہ میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور جن کا چلن بھی ہے۔ آج کی دنیا میں عالمی صلح، بقائے باہمی، عدم تعصب (کا نعرہ) اور تمام عقاید و افکار کا احترام فیشن کے طور پر رائج ہے۔ ہمارے ایک معاصر ادیب نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "جب تم اپنے عقیدے کی تبلیغ کرتے ہو تو دوسرے فرد کی اہانت کے مرتکب ہوتے ہو، یعنی تم باطل پر ہو۔

(اس طرح کی باتیں کرتے وقت) روشن فکر مسلمان یا وہ مسلمان جو نئے نئے روشن فکر بنے ہیں وہ بھی آزاد خیالوں، جمہوریت پسندوں اور انسان دوستوں ہی کی طرح خود بھی اسلام کو مسخ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسلام کا لفظ سلم سے نکلا ہے اور سلم کے معنی صلح اور ایسی صلح کے ہیں جو تمام طبقوں، مذہبوں، افکار اور عقیدوں کے درمیان سازش کارانہ بقائے باہمی سے عبارت ہے۔

یہ کتنی تعجب کی بات ہے، اسلام صلح نہیں ہے، اسلام جنگ ہے۔ دوسرے مذاہب کے عالموں، استعماری طاقتوں، نام نہاد روشن فکروں کے اتہامات اور ان کی سازشوں سے نہ تو متوحش ہونا چاہیے اور نہ ہی ان کے ڈر کی وجہ سے (اسلام میں) کوئی آمیزش کرنی چاہیے۔ آج اسلام

کو لباس نو عطا کرنا اور اس کے بارے میں کوئی جھوٹا دعویٰ کرنا بے کار ہے (کیونکہ) حقیقت کو اسی رنگ میں دیکھنا چاہیے جیسی کہ وہ ہے نہ کہ اس رنگ میں دیکھنا چاہیے جس کو لوگ پسند کرتے ہیں۔ جہاد کو دفاع کا نام دے کر اس کی توجیہ نہیں کرنی چاہیے کیونکہ جہاد کے احکامات دفاع کے احکامات سے یکسر مختلف ہیں اسلام حق و باطل کی جنگ ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے شروع ہوئی ہے اور تا قیام قیامت برپا رہے گی۔

اسلامی معاشرہ کی وہ تحریکیں جو متاخر مسلمان مصلحوں کے ذریعہ انیسویں صدی عیسوی سے لے کر آج تک چین سے لے کر خلیج فارس اور شمالی افریقہ تک عالم وجود میں آئیں۔ وہ اسی تاریخی تحریک کا ایک تسلسل ہیں جس پر ابراہیمی ادیان کے فلسفۂ تاریخ کی بنیادیں رکھی گئی ہیں۔ یہ تحریک کلامی، فلسفیانہ اور مابعد الطبیعاتی مسایل کے گنبد بے در میں محصور نہیں ہے۔ اس (اسلامی) جنگ و جدل کی تیز دھار، اس غیر ذمہ دارانہ نظام کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھتی ہے جو تاریخ، زندگی اور عوام کا حاکم بن گیا ہے۔

آپ ایشیا اور افریقہ کا ایک اٹلس اپنے سامنے کھول کر رکھیں۔ بہتر ہے کہ افریقہ کا نقشہ اپنے سامنے رکھیں کیونکہ ہم افریقہ کے ان تمام انقلابوں اور تحریکوں سے آگاہ ہیں جو استعماریت اور مغربیت کے خلاف وہاں وجود میں آئی ہیں اور جن کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اور وہ آج بھی معرض بحث میں ہیں۔

افریقہ (دو سلسلوں پر مشتمل ہے) ایک سلسلے میں اسلامی ممالک اور قومیں ہیں اور دوسرے میں غیر اسلامی ممالک اور قومیں۔ دنیا کے نقشے میں ان دونوں سلسلوں کا شمار افریقہ ہی میں ہوتا ہے لیکن فرانسیسی مصنف کے قول کے مطابق شمالی افریقہ آنسو کے ایک قطرے وہ بھی گرما گرم قطرے کا مماثل ہے ہاں! افریقہ زمین کا آنسو ہے، زمین کا قلب گداختہ ہے، یہ قلب بھی آنسو ہی کے مانند ہے کیونکہ قلب و اشک ہمزاد بھی ہیں اور ایک دوسرے کے ہمدرد بھی۔ افریقہ بھی اشک و قلب دونوں ہی کا عزیز قریب ہے۔

(شمالی) افریقہ اس رنجور ستم دیدہ کرہ کا قلب، ایک آنسو اور ایک داغ ہے۔ تاریخ کے گذشتہ ادوار میں یہ ہمیشہ غلامی کی آگ میں جلتا رہا اور اس جدید زمانے میں استعمار کی آگ میں جھلس رہا ہے اور آج بھی جل بھن رہا ہے۔

تاریخ کے گذشتہ ادوار میں وقتاً فوقتاً صرف اسلامی ملکوں پر لوگوں کو غلام بنا لینے کا اتہام لگایا جاتا رہا ہے مگر ان ممالک پر غلاموں کی تجارت کا اتہام کبھی نہیں لگایا گیا۔ کسی بھی زمانے میں کوئی بھی شخص مراکش، ٹیونس، الجزائر یا مصر سے لوگوں کو غلام بنا کر اپنے وطن نہیں لے گیا لیکن عصر جدید میں پورا کا پورا

براعظم افریقہ طاقت و قوت یا مکر و فریب کے ذریعہ استعماری قوتوں کی گرفت میں چلا گیا۔ وسطی، مغربی اور مشرقی افریقہ ابھی حال ہی میں اس طرف متوجہ ہوئے ہیں (کہ اس بات کا پتہ لگائیں کہ) استعمار کب ان کے یہاں در آیا اور بڑی آسانی کے ساتھ ان پر مسلط ہو گیا۔

یہ استعمار، مسیحی مبلغوں کی ایک جماعت یا یوروپی مہاجرین کی شکل میں ان کے یہاں اس لیے وارد ہوا کہ وہاں اپنا سرمایہ لگائے، اس سرزمین کو آباد کرے، پیداوار اور کام بڑھانے کے نئے نئے طریقے نکالے اور اس سرزمین کو ترقی کی طرف لے جائے۔ استعماری طاقتیں خود تو اس سرزمین کے ایک گوشے میں اپنی زندگانی بسر کریں اور وہاں کے دیہاتوں کو (ترقی یافتہ بنا کر) ان پر نئے جلا کریں۔

یا یہ استعماری طاقتیں فرانسیسی اور انگریز تاجروں کی ایک جماعت کی شکل میں انتہائی آسانی بلکہ کبھی کبھی مقامی لوگوں کی مرضی، مدد اور استقبال کے ذریعہ اس سرزمین پر وارد ہوئیں اور رفتہ رفتہ وہاں کی تمام چیزوں کی مالک بن بیٹھیں۔

وہ[۱] شخص مٹھی بھر رنگا رنگ شیشوں کے ٹکڑے اپنے پاس رکھتا تھا (مصنوعی رنگین شیشہ اسی زمانہ میں یوروپ میں نیا نیا ایجاد ہوا تھا) وہ ان شیشوں میں سے چند ٹکڑے (اپنے ساتھ) لے جاتا اور افریقی قبایل کے سرداروں اور معزز لوگوں کو دیتا۔ خاص طور سے وہ کسی جشن کے دوران یا کسی شادی کے موقع پر یا کسی قبیلہ کے کسی یوم مسرت میں اُن شیشوں میں سے تھوڑے سے شیشے ان کو دے کر اس کے عوض میں بھیڑوں کا ایک گلہ لے لیتا۔

تعیش پرستی، غیر متمدن بدویت کی اصل خصوصیت اس کی فکر اور روح ہے۔ غیر متمدن اور جدید (ماڈرن) بدویت کے تعیش میں کوئی فرق نہیں ہے۔ تعیش پرستی ان سطحی اور تہی مایہ روحوں کی ضرورت ہے جو روح کی زیبائی، معنوی سرمایوں، تناظرات، انقلابات اور ایمان، تفکر، علم و ہنر، ادب و فلسفہ کی عظمتوں اور ان پروازوں سے محروم ہیں جو انسان کو عالم حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔ اس حقیقت کو ان افراد کے باہمی موازنہ و مقابلہ کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔ جو فکری بلوغ، تہذیب اور اجتماعیت کے مختلف درجات پر فائز ہیں (افراد ہی کی طرح) قوموں کا بھی یہی حال ہے۔

---

[۱] اس کتاب کا ترجمہ "اتحادیہ محصلین و دانشجویان ایرانی در ہند" کے متن کے مطابق ہے۔ یہ متن، اس متن سے مختلف ہے جس کو "حسینیہ ارشاد" نے "اتحادیہ انجمن ھای اسلامی در اروپا" کی شرکت میں شایع کیا ہے۔

(مترجم)

وہ اپنا گلا دے دیتا اور رنگین شیشے کے لیے کاؤچوک[1] پر دستخط کر دیتا۔

انیسویں صدی عیسوی میں ایک فرانسیسی شعبدہ باز نے خشک دودھ کے ذریعہ ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ انیسویں صدی کا زمانہ مخصوص خصوصیات کا زمانہ ہے۔ (اس زمانہ میں) یوروپی معاشرہ میں نئے نئے مکاتیب فکر کی بنیاد ڈالی جاتی رہی اور اسلامی معاشرہ میں مذاہب کی۔ اس صدی کے پچاس برسوں میں گیارہ عدد "امام زماں" ظاہر ہوئے۔ یہ ائمہ ایک دوسرے کے معاصر تھے اور ان کے زمانۂ ظہور میں تین چار سال سے لے کر بارہ سال سے زیادہ کی مدت کا فرق نہیں تھا (اس زمانے میں جو نئے نئے مذاہب ایجاد ہوئے) انہی میں سے ایک خشک دودھ کا مذہب تھا۔

اس زمانے میں خشک دودھ نیا نیا بنایا گیا تھا (اس فرانسیسی شعبدہ باز نے) چند کلو خشک دودھ لیا اور افریقہ چلا گیا۔ اس نے وہاں کے لوگوں سے کہا۔ خدا نے تمہاری بھوک کو دیکھا اور اس کو تمہاری ناداری اور فاقہ کشی پر رحم آ گیا۔ اس نے مجھ کو تمہاری نجات کے لیے بھیجا ہے۔ میرے پاس ایک معجزہ ہے، یہ معجزہ دوسرے بنیوں کے ان معجزوں کی طرح نہیں ہے جن سے انسان کا پیٹ نہ بھر سکے۔ میرے پاس ایک مثالی معجزہ ہے جو عینی اور مابعد الطبیعی نہیں ہے۔ جب تم اس کو کھاؤ گے تو سمجھ جاؤ گے۔ تمہارے پاس پانی تو ہے ہی۔ خدا نے مجھ کو یہ قوت و قدرت عطا کی ہے کہ میں افریقہ کے بھوکے لوگوں کے لیے پانی کو دودھ بنا دوں، دودھ بالکل اصلی دودھ۔ جس شخص کو اس بات پر یقین نہ ہو تو وہ جائے اور جا کر پانی لے آئے۔ لوگ گئے اور جا کر پانی لے آئے۔ اس نے کچھ مخصوص الفاظ پڑھتے پڑھتے اور کچھ مخصوص رسوم ادا کرتے کرتے لوگوں سے چھپا کر تھوڑا سا خشک دودھ کا پاؤڈر پانی میں ملا دیا۔ تمام حاضرین نے اس کو پیا اور محسوس کیا کہ واقعی وہ اصلی دودھ ہے پھر وہ لوگ اس پر ایمان لے آئے۔

آج بھی بہت سے ایسے نغمے اور دعائیں باقی ہیں جن میں اس "خشک دودھ کے پیغمبر" کی عظمت و بزرگی کے گیت گائے گئے ہیں۔ جب اس کو مزید کامیابی و ترقی حاصل ہو گئی تو اس نے اپنے ایرانی "ہم کار" اور معاصر کی طرح یہ اعلان کر دیا کہ میں "باب" ہوں، مہدئ موعود ہوں، پیغمبر ہوں اور خود خدا ہوں جو بشریت کے لباس میں جلوہ گر ہوا ہوں وہ "نقطۂ اولیٰ" میرے بعد آئے گا میں اس کے مبشر کی حیثیت سے آیا ہوں۔

---

[1] "مادہ ایست کہ از تنۂ درخت انجیر مخصوصی گرفتہ می شود۔ شیرابۂ این درخت را وقتی گرم کنند کاؤچو خام بدست می آید و آن جسمی است نرم کہ در صنعف برای ساختن اشیاء گوناگون بکار می آید"

(مرسلہ ڈاکٹر نور الحسن انصاری)

جب میں چلا جاؤں گا تو وہ آئے گا اس نے جب اپنے بعد آنے والے کی بشارت دے لی تو پھر فاتح مصر و افریقہ جنرل گیوم (اس سرزمین پر) وارد ہوا۔

وہ لوگ جو "خشک دودھ کے پیغمبر" کے معتقد اور اس کے موعود کے منتظر تھے انہوں نے جنرل گیوم کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ آج بھی نجات دہندہ حاجی گیوم کی عظمت و بزرگی کا گیت گانے والے بہت سے نغمات موجود ہیں۔ ان نغمات کو میرے آن موریٹانیہ[1] کے ایک دوست نے نقل کیا ہے جنہوں نے ان لوگوں کی اس مذہبی تحریک پر تحقیقی کام کیا ہے۔

یہ کل کا افریقہ تھا ——— استعمار بلی کی سی انتہائی آہستگی اور بے شور و شغب افریقہ میں وارد ہوا اور اس وقت کوئی بھی یہ نہ سمجھ پایا کہ یہ کہاں سے وارد ہوا ہے؟ اس بات کو انہوں نے اس وقت سمجھا جب ہزاروں نومولود اس دنیا میں آ چکے اور ان کی نسل چوتھی، پانچویں، چھٹی پشت میں پہنچ گئی، اس بات کو انہوں نے اس وقت سمجھا جب اس مسئلہ پر بحث ہونے لگی کہ افریقیوں کو افریقہ پر حکمرانی کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

آج کے افریقہ میں جو موکینیاٹا، لومبا، نریرے، نکرومہ، امہ سزر، علیون دیپ جیسے عظیم رہبر و مفکر موجود ہیں جو اس بات کا پتہ لگانے میں مصروف ہیں کہ یہ "فرنگی جن" کس طرح آئے اور کس طرح افریقہ (کی روح) میں حلول کر گئے۔

کینیا کے عظیم رہنما جوموکینیاٹا کا ارشاد ہے "جب یورپی لوگ آئے تو ہمارے پاس زمینیں تھیں اور ان لوگوں کے پاس انجیل، اب حال یہ ہے کہ زمینیں تو ان کے پاس ہیں اور ہمارے پاس صرف انجیل ہے۔

اگر ہم ۱۸۱۲ء سے لے کر ۱۹۴۱ء تک کے زمانے پر ایک نظر ڈالیں تو وہ کون سا ایسا سال ہے جس میں شمالی افریقہ اور افریقہ کے اسلامی معاشروں میں تلوار زمین پر رکھ دی گئی ہو۔ یہاں تک کہ شمالی افریقہ کے صحرا، دور افتادہ دیہات اور ان میں بسنے والے قبیلے ایک دائمی میدان جنگ بن گئے۔ اس جنگ میں انسانیت، قومیت اور مذہب کے آزادی خواہ اور بے میل تہذیب و تمدن، قومی، اسلامی زبان کے علمبرداران ایک طرف ہیں اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں، جو ان تمام باتوں کی نفی کرتے ہیں یہ آزادی خواہ ان تمام علمی، معاشرتی، تہذیبی، معاشی اور فوجی یورشوں کے خلاف لڑ رہے ہیں جو

---

[1] MAURITANIAN

چالاک اور متمدن فرانس ان پر کیے جا رہا ہے اور فرانس سے پہلے اسپینیوں نے اور مصر میں انگریزوں نے بھی اسی طرح کے حملے کیے (اور وہاں بھی ان حملوں کا یہی رد عمل ہوا) آخر کار یورپ کو شکست ہوئی یہ جنگ ایک صدی سے زیادہ یعنی ۱۲۰ سال تک طول پکڑ گئی۔ اس عرصہ میں چار پانچ نسلیں وجود میں آئیں اور ختم بھی ہوئیں اور یہ ساری کی ساری نسلیں فرانسیسی ہو گئی تھیں، اہل فرانس نے اعلان کر دیا تھا کہ "جس طرح دریائے سن، پیرس کے وسط میں بہتا ہے اسی طرح بحر روم فرانس کے وسط میں بہتا ہے" کیونکہ بحر روم کے اُس پار الجزائر، ٹیونس، مراکش واقع ہیں اور اِس پار فرانس۔ اسی لیے (یہ کہا جاتا کہ) بحر روم فرانس کے وسط میں بہتا ہے۔ جب ہم افریقہ میں داخل ہوتے ہیں تو ہم کو بیشتر جگہوں پر ایسے بورڈ لگے دکھائی دیتے ہیں جن پر لکھا ہوتا ہے کہ "یہ فرانسیسیوں کا علاقہ ہے"۔ ان تمام باتوں کا مقصد یہ تھا کہ یہ مقامی لوگ فرانس کے تہذیب و تمدن میں اس طرح رچ بس جائیں کہ وہ لوگ خود بخود اپنے آپ کو فرانسیسی محسوس کرنے لگیں۔

آخر وہ کون سے اسباب تھے جن کی بنا پر استعمار اس بات پر تیار ہو گیا کہ جن افریقی بربروں اور عربوں کو وہ لوگ (اہل استعمار) جنگلی چوہے کہتے اور ان کی نسل و حسب و نسب کا مذاق اڑاتے، انہی بربروں اور عربوں کو فرانسیسی کہنے پر آمادہ ہو گئے؟ مزید براں وہ کون سے اسباب تھے جن کی بنا پر اہل استعمار اس بات کے بھی خواہاں ہوئے کہ افریقی بربروں اور عربوں کو اپنی ملت میں جذب کر لیں اور غلاموں (بربروں اور عربوں) کو آقاؤں (فرانسیسیوں) کی نسل و ملت میں شامل کر لیں لیکن وہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان محسوس نہ کرنے پائیں؟

(اس کی وجہ یہ تھی کہ) اگر ایک بار بھی اس "مرد بربر" (عرب و بربر) نے اپنے آپ کو مسلمان محسوس کر لیا اور اگر ایک بار بھی وہ اپنی تیرہ سو سالہ تاریخ، فکر، تہذیب و تمدن، ہنر، ذہانت اور جنگی شان میں جذب ہو گیا تو اس پر مسلط ہونا ناممکن ہو جائے گا۔ اسی لیے اس کے تمدن کو ملیامیٹ کرنا چاہیے تاکہ اس کا تشخص ہی ملیامیٹ ہو کر رہ جائے۔ وہ اتنا فرنگی مآب ہو جائے کہ وہ خود فرنگیوں کی شبیہ بن جانے کی تمنا کرنے لگے۔ وہ مسلمان جو اپنے تمدن، تاریخ، شخصیت، عظیم فکری سرمایے، مدنیت، اخلاقی اور مجاہدانہ اوصاف کا احساس رکھتا ہے ہرگز ہرگز شیطان فرنگی کا "بربری بندر" نہیں بن سکتا۔

افریقہ کے مسلمان کو اپنے عظیم تمدن اور تابناک گذشتہ تاریخ کا احساس تھا اسی لیے استعمار ان کو رام نہ کر سکا۔ اس کی آنکھیں فرنگیوں کے جلال و جبروت سے خیرہ نہ ہوئیں اور وہ استعمار کے خلاف ہمیشہ برسر پیکار رہا مگر اس کی یہ جنگ پراگندہ بھی تھی اور کئی محاذوں پر بٹی ہوئی بھی۔

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ پراگندگی اور کمزوری کیوں تھی؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کی اپنے تمدن اور اسلام سے آگاہی کمزور اور پراگندہ ہو چکی تھی۔ ان کا معاشرہ روایتی اور انحطاط پذیر ہو چکا تھا، اس بات کی تصدیق ان تین ممتاز ترین مورخین (فرحت عباس، عمر ادزغان اور نہری ماتینہ) کی تحریروں سے بھی ہوتی ہے جنہوں نے افریقہ کے مسلمانوں کی بیداری کی تاریخ لکھی ہے۔ شمالی افریقہ کے مسلمانوں کی تحریک بیداری کی اگر ہم ابتدائی تاریخ متعین کرنا چاہیں تو اس کی ابتدا اس زمانے سے ہوگی جب محمد عبدہ مصر کو خیرباد کہہ کر ٹیونس، مراکش اور الجزائر کے ممالک میں تشریف لائے انھوں نے نہ تو جلسے کیے نہ ہی تلوار اٹھائی اور نہ ہی کسی سیاسی جماعت کی فوری تنظیم کی۔ (بلکہ انھوں نے یہ کیا کہ) شمالی افریقہ کے اُن علما کو ایک جگہ پر مجتمع کر دیا جو تاملات و ترددات کے خول میں اسیر اس علم و دانش کے حامل تھے جو نہ تو افراد میں حرکت ہی پیدا کرتی ہے اور نہ ہی کسی شخص میں احساس ذمہ داری۔

یہ وہ علما تھے جنہوں نے غلطی سے "قدیم علوم" کو "اسلامی علوم" سمجھ رکھا تھا۔ یہ وہ علما تھے جو اسلام کو ایک ضابطۂ حیات یا متحرک، فعال، روح پرور اور احساس ذمہ داری سے بہرہ ور کرنے والا مذہب نہیں تصور کرتے تھے بلکہ وہ اس کو علوم و فنون اور قوانین کی تعلیمات کا ایک مجموعہ سمجھتے تھے۔ ایسے علمی ماحول میں تفسیر قرآن کو ایک "بدعت" کی شکل میں اسلامی علمی ماحول میں داخل کرنا چاہیے کیونکہ اس علمی ماحول کے ذریعہ زندہ و متحرک، بنانے بگاڑنے والے، صاحب فکر و اقتدار استعمار کے خلاف جنگ نہیں لڑی جا سکتی اور اسلامی اقتدار پر استعماری قوتیں تہذیب، تمدن اور مغربی فلسفہ کی راہ سے جو حملے کر رہی ہیں ان کا دفاع نہیں کیا جا سکتا۔

(ایسے ماحول میں) محمد عبدہ آتے ہیں اور تمام مسلمان علما کو آواز دیتے ہوئے یہ کہتے ہیں "اب قدیم علوم کی تمام شاخوں سے دست بردار ہو جاؤ، صرف اور صرف قرآن کی آگاہانہ تفسیر کرنے اور لوگوں میں قرآن فہمی پیدا کرنے کے عمل میں مشغول ہو جاؤ۔"

قرآن شناسی کی یہ روایت پہلی بار انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں روشن فکر، ترقی پذیر علما میں پیدا ہوتی ہے (ورنہ اس سے پہلے کے زمانے کا بھی وہی عالم تھا جو) آج ہمارے زمانے میں بھی ہے کہ قرآن پڑھانے اور سمجھانے کے لیے نہیں ہے اور اس کے معانی ہم سے پوشیدہ ہیں۔

کیا قرآن استخارہ نکالنے کے لیے ہے یا چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے وقت حصول برکت کے لیے؟ یا تبرک، وسیلہ، نقصانات سے مامونیت، دودھاری گائیوں کے تھنوں کی حفاظت، تعویذ، محفل نکاح کا شگون اور بچہ کے گلے اور بازو میں باندھنے کے لیے ہے؟ یا پھر اس لیے

ہے کہ اس سے بیان و بدیع کا درس دینے کے لیے صنایع و بدایع کی مثالیں ڈھونڈی جائیں ؟

یہ قرآن کھل گیا اور یہ معاشرہ، یہ قدیم فرسودہ مدرسے جن کے دروازوں پر گرد جم چکی تھی کھل گئے اور غور و فکر، احساس ذمہ داری، سیاسی اور معاشری آگاہی، خود شناسی اور ایک خاص مقصد کے ساتھ، راستے کی تلاش میں حرکت میں آگئے۔

نئے نئے الفاظ اور نئے نئے شعار عالم وجود میں آئے "قرآن کی طرف بازگشت کی تحریک" کے فوراً بعد ہی محمد عبدہ کے ہاتھوں جو سید جمال الدین کی فکری تحریک سے بیدار ہونے والے مفکروں میں سے ہیں، مسلمان علما کے معاشرہ کی تشکیل ہوتی ہے۔

نقطۂ نظر کی اس تبدیلی اور مذہبی روشن فکری کی انقلابی اور سماجی اہمیت و قیمت کو صحیح طور پر وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو قدیم علوم کے اداروں کی فکری وضع سے واقفیت رکھتا ہو اور استعماری تمدن کے منصوبوں خاص طور سے انیسویں صدی عیسوی کے منصوبوں سے بھی پوری طرح واقف ہو۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس فکری اور تمدنی انقلاب اور سماجی بیداری سے بھی واقف ہو جو عہد وسطیٰ میں نشاۃ ثانیہ اور پروٹسٹنٹ ازم کے نام سے عالم وجود میں آئی۔ یہی وہ نعرہ تھا جس کو سید جمال الدین نے بلند کیا۔

شمالی افریقہ کے مذہبی معاشرہ میں نقطۂ نظر اور مذہبی فکر کی اتھل پتھل کی وجہ سے "ستارۂ شمال افریقہ" کے نام سے سب سے پہلی اس سیاسی جماعت کی تشکیل ہوئی جس کا مقصد شمالی افریقہ کے مسلمانوں کو تمدنی، اقتصادی، فوجی اور سیاسی قید سے رہائی دلانا تھا۔ یہی وہ تحریک تھی جس نے بعد میں مختلف گروہوں اور سیاسی جماعتوں کی شکل میں متشکل ہو کر مسلحانہ جنگ کا آغاز کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی افریقہ کی مسلمان ملتیں آزاد ہو گئیں۔

افریقہ کی مسلمان قوموں کی آزادی کے بعد ہی وہاں کی سیاہ فام قوموں کی بیداری اور آزادی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

یہاں پر ایک سوال یہ سامنے آتا ہے کہ استعماری قوتوں کے خلاف اس جنگ میں افریقی مسلمان غیر مسلم اقوام سے پہلے ہی کیوں اٹھ کھڑے ہوئے ؟ کیوں یہ لوگ ایک براعظم میں بہت جلد بیدار ہو گئے اور بہت جلد فرانسیسیوں اور انگریزوں کے خلاف آمادۂ پیکار ہوئے۔ حالانکہ ایک عرصۂ دراز تک یہی لوگ مغربی طاقتوں کے زیر سایہ اپنے آپ کو خوش و خرم محسوس کرتے تھے۔ مغربیت اور مغربی تمدن کے خلاف مسلمانوں کے اٹھ کھڑے ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ان کی بنیادیں عظیم معنوی تعلیمات پر استوار تھیں جن کو انہوں نے

محفوظ بھی رکھا تھا۔ یہ بنیادیں اسلامی تعلیمات کی بنیادیں تھیں جو بجائے خود فکر، روح اور احساس کو متحرک کرنے والی، طاقت ور اور قوت تخلیق کی حامل تھیں۔ ناممکن ہے کہ کوئی مسلمان ان تعلیمات کے برخلاف اپنی اجتماعی و معاشرتی ذمہ داری کو محسوس نہ کرے۔

اسلامی تعلیمات، بودھی، ویدک، مسیحی، زرتشتی اور مانوی مذاہب کی طرح صرف روحانی، اخلاقی اور مابعد الطبیعاتی تعلیمات ہی نہیں ہیں بلکہ اجتماعی، سیاسی اور احساس جوانمردی و ذمہ داری پیدا کرنے والی تعلیمات ہیں۔ وہ قرآن جس نے مذہبی، فقہی اور عبدیت سے متعلق احکامات دینے سے کہیں زیادہ جہاد کی بات کہی ہے، وہ پیغمبر جس نے اپنی پوری زندگی، اپنے معاشرہ کی حفاظت کے لیے دشمن کے خلاف سیاسی اور مسلحانہ جنگ میں گزاری اور اپنے مدینہ کے دوران قیام ہر چالیسویں دن کسی نہ کسی غزوہ میں سرگرم عمل رہے ہوں، وہ تاریخ اسلام جو کہ جہاد، جوان ہمتی اور قدرت و طاقت کی تاریخ ہے، ایک مومن کو کس طرح بے راہ روی، غلامی، سیاسی ذلت اور عالم مستی میں مبتلا دیکھ سکتی ہے؟

وہ اسلام جس پر اتہام لگایا جاتا ہے کہ وہ تلوار کا مذہب ہے، ان مذاہب میں نہیں ہے جو جذبۂ عمل کو مردہ کر دینے والے مذاہب ہیں۔ انیسویں صدی عیسوی کے ربع سوم کا زمانہ مختلف پختہ و ناپختہ شکلوں میں مغربیت اور استعمار کے خلاف شورشوں کے بپا ہونے کا زمانہ ہے۔ ایران میں ایرانی عوام نے علماء کی سربراہی میں جو "تحریکِ تنباکو" چلائی تھی (وہ بھی اسی شورش کی ایک شکل ہے) اس کی اہمیت اور قدر و قیمت سے ہم صحیح طور پر واقف نہیں ہیں۔

یہ تحریک میرزا حسن شیرازی کے ایک مختصر سے فتوے سے شروع ہوتی ہے جس سے سب ہی حضرات واقف ہیں۔ یہ فتویٰ سید جمال الدین کے خط سے متاثر ہو کر دیا گیا تھا (جس میں سید جمال الدین نے میرزا حسن شیرازی کو) خبردار کیا تھا کہ یہ مسئلہ صرف تنباکو کا نہیں ہے۔ یہ لوگ (انگریز) یہ نہیں چاہتے کہ ہمارے تنباکو کو دھواں بنا کر اڑائیں بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ خود ہم کو جلا ڈالیں ہمارے وجود میں نقلب کرکے اس کو دھواں بنا کر اڑا دیں۔ کمپنی کی وہ عمارت جو تہران میں بنائی جا رہی ہے اس پر نظر ڈالیے، یہ تمام برج، دمدمے اور وہ دیوار جس کی چوڑائی دس میٹر ہے کس لیے (بنائی جا رہی ہے؟) تنباکو کے لیے اس طرح کے برج و دمدمے کی ضرورت نہیں ہے، یہ تو ایک سیاسی اور جنگی مرکز ہے۔

میرزا نے ذمہ داری کو محسوس کیا اور اعلان کر دیا . . . .

ملاحظہ فرمایئے اسلام میں کس طرح سے دین اور دنیا کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور فی الواقع (اسلام میں) اس طرح کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ استعمار نے کس طرح یہ باتیں (تفریق دین و

دنیا) ہمارے منہ میں ڈال دی ہیں اور ہمارے روشن فکر حضرات بھی طوطی کی طرح انہی کی کہی باتوں کو دہرا رہے ہیں اور کہتے رہے ہیں کہ مذہب' زندگی سے جداگانہ چیز ہے (ہمارے روشن فکر حضرات یہ بات اس لیے کہتے ہیں کہ) ان کی نظر میں اُن روشن فکروں کی مثال ہے جو کلیسا (کے خیالات کے) مخالف ہیں۔ یہ روشن فکر حضرات اس بات سے غافل ہیں کہ ان کا یہ ارشاد قیاس مع الفارق ہے۔ میرزا حسن شیرازی کے فتوے کے الفاظ یہ ہیں:

"اس وقت سے تنباکو کا استعمال خواہ وہ کسی شکل میں ہو' امام زمان سے متحارب ہونے کے حکم میں ہے۔"

ناصرالدین شاہ اور شاہزادہ کامران میرزا جو نائب السلطنت اور وزیر جنگ بھی تھے' اپنے غلام سے کہتے ہیں' جا' جاکر حقہ لے آ! لیکن وہ نہیں لاتا' اُس کی بیوی اس کے لیے حقہ نہیں بھرتی زنان خانہ میں سب ہی حقہ کی عادی تھیں' اس حکم کے بعد سب نے ایک ہی دن کے اندر اندر سارے حقے توڑ ڈالے۔

کیا اس عظیم انسان گاندھی کی تحریک "منفی مزاحمت" جو کہ تحریک "تحریم تنباکو" کے کچھ ہی عرصے بعد شروع ہوئی تھی' اس تحریک (تحریم تنباکو) سے متاثر نہ تھی؟ میرزا (حسن شیرازی) کی تحریک اُس اقتصادی استعمار کے خلاف تھی جو رژی کمپنی کی شکل میں (ہندستان کی ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرح) ایران میں وارد ہوئی تھی۔

نہ ہی کسی نے جنگ کی اور نہ ہی کوئی اور کام کیا' صرف اور صرف تنباکو کا نہ استعمال کیا نہ خریدا۔ اور صرف سب نے اجتماعی طور پر "منفی مزاحمت" کو اپنایا۔ استعمار کا وہ اولین درخت جس کو علی الاعلان یہاں نصب کیا گیا تھا اور جو برگ و بار لانے ہی والا تھا اس کو (لوگوں نے "منفی مزاحمت" کے ذریعہ) اکھاڑ پھینکا۔ وہ استعمار جو کروڑوں روپے اس لیے خرچ کرتا تھا کہ دھیرے دھیرے کر کے بازاروں' معدنی کانوں' پیداوار کے دوسرے ذریعوں حتیٰ کہ انسانوں کو بھی اپنے تصرف میں لے آئے اور اس کے بعد پھر ان کے ذریعہ سے اپنی جھولیاں بھرے۔ اس استعمار نے دیکھ لیا کہ یہاں اور مسلمانوں کے اس معاشرہ میں جہاں پر کہ لوگ صرف ایک فتوے پر ہنگامہ برپا کر دیتے ہیں اور اس مذہب کی موجودگی میں جس کے پیرو "نشہ آور چیزوں کے چکر" میں بھی ہوش میں آجاتے ہیں اور فوراً سیاسی ہو جاتے ہیں سرمایہ نہیں لگایا جا سکتا۔

اس وقت بھی جب کہ ہمارے عوام "روشن فکر" نہیں تھے صرف ایک مرزا ملکم خاں (ہی

"روشن فکر" تھا) جس کی باتوں پر کوئی شخص کان نہ دھرتا تھا (کیونکہ وہ ایک) شعبدہ گر، بدنام، اور لاٹری باز چور تھا)، رزی کمپنی کے خلاف، منفی مزاحمت اور تحریک تنباکو کی کامیابی کے بعد ہی گاندھی پورے ہندستان میں انگریزوں کے خلاف منفی مزاحمت اور بدیشی اشیا کے مقاطعے کا اعلان کرتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ خالی ہاتھ ہونے کے باوجود وہ ایک بڑی اور مضبوط حکومت کے تسلط کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ اور اس کے ہاتھوں کو قلم کر کے رکھ دیتے ہیں اور انگلستان اپنے زور و طاقت کے عروج کے زمانے میں اس زرخیز سرزمین سے دست بردار ہو جاتا ہے۔

استعمار اسی وقت اپنی زندگی کو برقرار رکھ سکتا ہے اور جادۂ ترقی پر گامزن ہو سکتا ہے۔ جب کہ مقامی افراد اس کی پیداوار کے لیے مزدور بن جائیں اور اس کی مصنوعات کو استعمال کرنے لگیں۔ اگر مقامی افراد (استعمار کا) مقابلہ کرتے ہیں، ماڈرن نہیں بنتے اور خود اپنی بنائی ہوئی چیزوں کا استعمال کرتے ہیں تو استعمار دم توڑ دیتا ہے۔۔یہی وجہ ہے کہ استعماری طاقتوں نے پہلے ہم کو ماڈرن بنایا پھر ہم پر مسلط ہو گئے۔

انیسویں صدی عیسوی کے اواخر ہی سے مشروطیت (قانون خواہی) کی ابتدا کے مظاہر نظر آنے لگے۔ طلب انصاف، قانونی حکومت (کا قیام) اور شخصی استبداد کو رد کرنے کا اعلان انیسویں صدی کے اواخر میں ہوا۔ یہ سب کچھ اس عظیم ترین انقلاب سے پہلے ہوا جس نے مشروطیت کی تحریک کو ایک مسلح بغاوت کی شکل میں ظاہر کیا تھا۔ ہر انقلاب کے پہلو میں ایک فکری اور تمدنی تحریک مضمر ہوتی ہے جو انقلاب کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔

انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں تمام اسلامی افریقی ممالک (ٹیونس، الجزائر، مراکش، مصر اور سوڈان ....) مسلح اسلامی انقلاب کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے اور انہوں نے یوروپی مسلح افواج پر حملے کرنے شروع کیے، اگرچہ سیاسی اور جنگی نقطۂ نظر سے (یہ عمل) ہندستان میں بعد میں شروع ہوا، تاہم اسی عہد میں (اسی عمل نے ہندستان میں بھی) اسلامی فکر اور تمدن میں انقلابی روح کو جاری و ساری کیا۔ وہ چیز جس نے استعمار کے خلاف ہندستان کی تحریک کو روحانی اور معنوی غذا بہم پہنچائی اور جس نے انقلاب کے لیے ہندستان کی سرزمین کو ہموار کیا وہ صرف قابل لحاظ و قابل مطالعہ ہی نہیں ہے بلکہ اس قابل ہے کہ اس پر رک رک کر ٹھہر ٹھہر کر غور و فکر بھی کیا جائے۔

لیکن یہ تمام شورشیں، تمام انقلابات اور اس وسیع و عریض منطقہ کے تمام ممالک کی بیداری جن پر اسلامی تمدن کی حکمرانی تھی، ان افراد کی رہین منت ہے جنہوں نے اپنے زمانے کی تمام مشکلات

اور اپنے وقت کے تمام افکار کے برخلاف اس آخری صدی میں اسلام کی "تجدید بنا" کا فریضہ انجام دیا۔ یہ تجدید بنا اقبال کی اصطلاح میں "تجدید تولد" ہے جس کی تعبیر و تشریح عصر جدید کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کی گئی ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے "مکتب اسلام" کے ٹکڑے ٹکڑے جسم کو دوبارہ نئے سرے سے اور اس کے اصل کے مطابق مدون و مرتب کیا جو جداگانہ طور پر اپنی اپنی جگہ ارتقا پذیر تھے اور ہر ٹکڑے کی جداگانہ طور پر تعظیم و تکریم کی جاتی تھی۔ ان لوگوں نے اس بات کی نشاندہی کی کہ اسلام کا مکمل پیکر اور مکمل اسلامی فکر یہی (ترتیب شدہ پیکر) ہے۔ یہی وہ مفکرین اور علما ہیں جو حقیقتاً "اسلام شناس" تھے۔

اسلام کی نشاۃ الثانیہ یا اقبال کی زبان میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے اولین بنیان گذار سید جمال الدین نے اس تحریک کے لیے جس نام کا انتخاب کیا تھا وہ "تحریک سلفیہ" تھا۔ یعنی یہ تحریک نئی تعبیرات کے ساتھ اپنی گذشتہ زندگی کی طرف لوٹ جانے اور آج کے بے جان و مردہ جسم میں اپنی حیات گذشتہ کی روح واپس لانے کی تحریک تھی۔

یہ ایک نیا جنم ہے، موجودہ زمانے میں انحطاط، نشہ آور اور مرگ آگیں تصور اور فرسودہ خیالی کے جو عوارض ایک متحرک سماج، قوت بخش و ارتقا نما مذہب کو لاحق ہو گئے ہیں ان کے خلاف ایک انقلابی اور ترقی پذیر عمل ہے۔

نشاۃ الثانیہ کی وہ تحریک جو کلیسا، ملایانہ خیالات اور قرون وسطیٰ کی جامد و ساکن صورت حال کے مدمقابل اٹھ کھڑی ہوئی اور جس نے یونان کے عہد زریں کی طرف مراجعت کا اعلان کیا، کیا وہ رجعت پسندانہ تحریک تھی؟ کسی چیز کے بارے میں فیصلہ کرتے وقت اس کی ظاہری شکل صورت، نام یا کسی فارمولے کے تحت کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ہر تحریک کسی قدیم اور رجعت پسندانہ تحریک کی بازگشت نہیں ہوتی۔

وہ اولین معاشرے اور ملتیں جو استعماری تہذیب و تمدن، غرب زدگی کی وبا اور یوروپی تمدن کے تھوپے جانے کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئیں اور انھوں نے ان سے نبرد آزمائی کا آغاز کیا وہ سب مسلمان معاشرے اور مسلمان ملتیں تھیں۔ مسلمان معاشروں اور ملتوں کی اس تحریک کے فوراً بعد ہی دوسر غیر یوروپی اور استعمار زدہ ممالک نے اپنے اپنے یہاں "اپنی اصل کی طرف مراجعت" اور مغربی تمدن کی قدروں کی بالادستی کی نفی کی تحریک کا آغاز کیا۔

انیسویں صدی کے اختتام اور خاص طور سے دوسری جنگ عظیم کے بعد سے افریقی اور لاتینی

امریکی رہنماؤں اور امہ سزر، علیون ادیب، سنگور، فرانز فینن، ٹیگور، رادھا کرشنن، سین یات سن جیسے عظیم مفکروں نے مغربی تہذیب کی بالادستی پر پیاپے حملے کرنے شروع کیے اور اعلان کرنے لگے کہ صرف مغربی تہذیب و تمدن ہی عالم انسانیت کا واحد اور بہترین تہذیب و تمدن نہیں ہے۔

ان قوموں کا اپنا اپنا تمدن تھا، اپنی اصل شکل و صورت میں ان کا مذہب بھی تھا، ان کے قوی فنون کی اپنی قدریں تھیں، مگر اس وقت یہ تمام قومیں حتیٰ کہ وہ قومیں بھی جن کے معاشرے تاریخی لحاظ سے متمدن معاشروں میں شمار ہوتے تھے، اس بات پر قانع ہوگئی تھیں اور انھوں نے اس بات کو تسلیم کرلیا تھا کہ عظیم ترین اور انسانی کوششوں کا شاہکار تمدن بلاشرکت غیرے مغربی اور صرف مغربی تمدن ہے۔

یہ مسلمان مفکرین اور ترقی پسند مسلمان علما جو استعماریت کے خلاف ہیں جو ایک انتقادی اور اسی کے ساتھ ساتھ تاریک پہلوؤں کو دیکھنے والی روح (کے حامل ہیں) اور خطرے کا اعلان کرتے ہوئے استعمار کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ آج کے سیاہ پوست (افریقی) معاشرہ میں امہ سزر، سنگور، جولیس نریرے جیسی شخصیتوں نے اپنی اصل کی طرف مراجعت کرنے کی عظیم فکر کا دنیا میں اعلان کر دیا ہے۔

سو سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے کہ مسلمان مفکرین کی طرف سے ملیامیٹ کر دینے والی وحشت ناک مغربیت کے تمام روپوں، خواہ وہ اقتصادی روپ ہو یا جنگی یا مغربیت کا خطرناک ترین روپ مغرب کی فکری امپیریلزم، سب کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا ہے۔

ہاں! مغربی استعمار کا خطرناک ترین اسی کے ساتھ ساتھ خفیہ ترین اور بہروپیا ترین قیافہ اس کا فکری اور تمدنی امپیریلزم ہے جو سب سے پہلے تو ہمارے افکار، خیالات اور حسِ ملّی کو ختم کرتا ہے، ہمارے اندر مذہب سے برگشتگی پیدا کرتا ہے۔ اپنے نفوذ اور استحکام کی جڑیں ذہنوں اور غیر یوروپی معاشروں میں پیوست کرتا ہے، سب کچھ چٹ کر جاتا ہے، اس کے بعد اقتصادی اور فوجی حملے شروع کر دیتا ہے۔ اگر تمدنی امپیریلزم کا وجود نہ ہوتا تو استعمار کا راستہ بھی کھلتا۔

یہ مسلمان مفکرین ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے استعمار کے تمدنی امپیریلزم کے کریہہ چہرے سے اُس روشن فکری، تہذیب و تمدن کی نقاب ہٹائی جس کا کام ہی دوسری تہذیبوں کو ملیامیٹ، مذہب، معنویت، روح اور کھرے پن کی نفی اور معاشرہ سے اخلاقی اور سماجی فضائل کو ختم کرنا تھا۔ ان مفکرین نے استعمار کی تمدنی امپیریلزم سے کنارہ کشی اختیار کی اور یہ محسوس کیا کہ سب سے پہلے

مغربی تہذیب و تمدن کے حملے کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ الجزائر میں مسلمان علما نے بڑی دانش مندی کے ساتھ اعلان کر دیا کہ "اسلام ہمارا دین، عربی ہماری زبان اور الجزائر ہمارا وطن ہے" اس اعلان کی وجہ یہ تھی کہ ان علما نے محسوس کیا کہ فرانس جدید تہذیب و تمدن اور استعمال میں آنے والی نئی چیزوں کو رائج کرنے کے لیے (ان کی سرزمین پر) وارد نہیں ہوا ہے۔ وہ اس لیے بھی وارد نہیں ہوا ہے کہ وہ الجزائر سے مادی فائدہ حاصل کرے اور وہاں کی خوشحالی و دولت کے تمام منبعوں کو غارت کر دے۔ نہیں! (وہ ان باتوں کے لیے نہیں آیا ہے بلکہ اس کے آنے کا مقصد یہ ہے کہ) وہ انسان کو مسخ کر دے، تاریخ کے تار و پود بکھیر کر رکھ دے اور الجزائریوں نے جو کچھ بھی انسانی قدریں حاصل کی ہیں ان کو نابود کر دے۔ ان لوگوں کے اس احساس کی وجہ یہ تھی کہ فرانس کا کہنا تھا کہ فرانسیسی ان لوگوں کی زبان اور قومیت ہے فرانس کی یہ بھی کوشش تھی کہ مسیحیت ان کا دین قرار پائے۔ ان علما نے اس بات کو محسوس کیا کہ فرانسیسی استعمار کے اس طریقۂ کار کے خلاف ان کو یہی طریقۂ کار استعمال کرنا چاہیے (کہ اسلام ان کا دین، عربی زبان اور الجزائر وطن ہے)

روشن فکر ہونے، سیاسی اور معاشرتی ترقیوں سے آگاہی رکھنے اور استعماریت کے خلاف ہونے کے یہی معنی ہیں نہ یہ کہ روشن فکری کے نام پر مغرب سے جو کچھ برآمد کیا جاتا ہے طوطے کی طرح اسی کو رٹا جائے۔ آج نوجوان روشن فکروں نے دوسری جنگ عظیم کے بعد استعمار کی مادی دنیا بالخصوص افریقہ میں اس حقیقت کا ادراک کر لیا ہے اور اس خطرے کو بھانپ لیا ہے جو استعمار کے تہذیب و تمدن کی شکل میں ان پر حملہ آور ہو رہا ہے۔

یہی وہ اصول ہے جس پر سیاہ پوست رہبر کاربند ہیں اور انہی کی تقلید میں لاطینی امریکہ کے ترقی پسند مفکرین رواں دواں ہیں۔

نریرے، مشرقی افریقہ کے ایک ممتاز ماہر سماجیات، رہبر اور مفکر ہیں۔ ان کی اپنی زبان انگریزی ہے، ان کے معاشرہ کے دوسرے اور مفکرین کی بھی زبان انگریزی ہی ہے انھوں نے کیمبرج اور لندن میں تعلیم حاصل کی ہے لیکن ان کے ملک اور ملک کے ناخواندہ عوام کی مادری زبان "سواحلی" ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ "سواحلی" زبان جو کہ ناپختہ اور مقامی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ پس ماندہ بھی ہے، اسکولوں کالجوں، مختلف تحقیقی، علمی اور سیاسی اداروں اور انجمنوں میں انگریزی زبان کی جگہ پر استعمال کی جائے۔

یہ ایک ایسے عظیم ترقی پسند روشن فکر شخص کا طرز فکر ہے جس کو دنیا ایک انقلابی کی حیثیت سے جانتی ہے۔ بیسویں صدی عیسوی کے وہ تمام لوگ جن کا تعلق "اس زمین کی مغضوب ملتوں" سے تھا اور وہ اپنی اپنی ملتوں کے انقلابی افراد گردانے گئے ہیں، ان سب نے اسی طرز فکر اور اسی اصول کو اپنایا ہے کہ مغربی تہذیب کی قدروں اور اس کے مختلف قالبوں کو رد کرتے ہوئے اپنی اصل اور اپنی تہذیبی اقدار کی طرف مراجعت کی جائے۔

اسلامی معاشروں میں مغرب، اس کی حیلہ سازیوں اور اس کے ایجنٹوں کے خلاف ہمارے روشن فکر علما اور دانش مندوں نے جو ترقی پسندانہ اور بیدار کرنے والی تحریکیں چلائیں، آپ حضرات ان کا کم از کم اجمالی مطالعہ ضرور فرمائیں کیونکہ یہ تحریکیں اس "تجدد بازی" کی تحریک کے خلاف تھیں۔ جس کا مقصد استعمار کے لیے ایک منڈی کی فراہمی اور اس کی مصنوعات کی کھپت کا ایک ذریعہ تلاش کرنا تھا۔ "تجدد بازی" کی یہ تحریک استعمار کے اشارے پر اُن مقامی متجددوں کے ہاتھوں عالم وجود میں آئی تھی جو بالکل ہی غلط طور پر اپنے آپ کو روشن فکر اور ترقی پسند کہتے تھے۔ اسلامی معاشرے کی تحریکوں نے انہی متجددین کی تحریک "تجدد بازی" کا مقابلہ کیا۔

ہر وہ تحریک جس نے مغربی استعمار کے تہذیبی، سیاسی اور اقتصادی حملوں کے خلاف ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے ایک قیامت بپا کر دی ملاحظہ فرمایئے کہ اس کے روح رواں دانا، بہادر اور ترقی پسند علما ہی تھے۔

میں یہ بات ایک مسلمان یا مذہبی مبلغ ہونے کی حیثیت سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہ ایک تاریخی اور سماجی حقیقت ہے جس میں نہ تو کوئی استثنا ہے اور نہ ہی جس کی تردید کی جا سکتی ہے۔

مجھ کو ان نام نہاد روشن فکروں سے کوئی سروکار نہیں ہے جو مذہب اسلام اور مسلمان علما کے بارے میں وہی باتیں دہرایا کرتے ہیں جو یورپی حضرات قرونِ وسطیٰ کی مسیحیت اور کیتھولک کلیساؤں کے بارے میں کہا کرتے ہیں۔

وہ لوگ جن کے فیصلے اور اعمال خود ان کی اپنی فکر، تحقیق اور براہ راست شناخت کی بدولت صادر ہوتے ہیں اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ مذہبی علما، مذہب، مسجد اور بازار کا ان آخر کے سو برسوں کی تحریکوں اور سیاسی انقلابوں کو بپا کرنے میں کیا کردار رہا ہے۔

اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام میں مسیحیت کی طرح روحانیت کا کوئی "منظم ادارہ" نہیں ہے کہ اس کے بارے میں کوئی عمومی حکم لگایا جائے۔

اسلامی علما، اپنے معاشرے اور عوام کے منتخب ترین افراد ہوتے ہیں جن میں سے ہر شخص کی شخصیت اپنی اپنی جگہ پر ایک تنظیم کی حیثیت رکھتی ہے اسی وجہ سے اسلام پر گفتگو کرتے وقت "روحانیت" نام سے موسوم کسی ادارہ کی بات کرنا سخت بچکانہ اور جاہلانہ فعل ہے۔

اس بات کے باوجود کہ ان لوگوں کے درمیان بھی زوال آمادہ حتیٰ کہ استبداد تک سے وابستہ لوگ رہے ہیں، ایسے عالم میں بھی ان لوگوں کا قرون وسطیٰ کے یوروپ کی "روحانی تنظیم" سے موازنہ کرنا منطقی نہیں ہے کیونکہ معاشرتی حقیقت کے اعتبار سے یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے برعکس و برخلاف ہیں۔

میرا کہنا ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ وہ تمام تحریکیں جو امپیریلیزم، استعمار اور یوروپ کے تہذیبی حملوں کے ردعمل کے طور پر مسلمانوں کے معاشروں میں چلائی گئیں ان کی باگ ڈور عظیم مسلمان علما اور مفکرین کے ہاتھوں میں رہی ہے اور کبھی کبھی انھوں نے خود یہ تحریکیں شروع کی ہیں۔

وہ تمام اسلامی معاشرے جو گذشتہ سو برسوں میں جدید تمدن سے آشنا ہوئے اور انھوں نے اپنے اقتصادی، سیاسی اور فوجی مسایل کے سلسلے میں یوروپ سے ربط ضبط رکھا، ان معاشروں پر ایک نظر ڈالیے تو وہ سیاہ معاہدے جو گذشتہ سو برسوں بلکہ سو برسوں سے زاید کے عرصے میں مرتب ہوئے اور افریقہ و ایشیا کے اسلامی ملکوں پر یوروپ کے استعماری امپیریلیزم کے ہاتھوں تھوپے گئے، ان میں سے کسی ایک معاہدے پر بھی کسی ایک بھی اسلامی ملک کے دستخط ثبت نہیں ہیں۔

انتہائی شرم و افسوس کا مقام ہے کہ تمام جدید تعلیم یافتہ لوگ جو "روشن فکر"، "جدید"، "غیر متعصب"، کے نام سے مشہور ہیں اور جن کو "دنیا شناسی" "انسانیت دوستی" اور ترقی پسندی کا حامل سمجھا جاتا ہے وہ سب کے سب غیر مذہبی لوگ ہیں۔ حتیٰ کہ اگر علما میں سے کسی شخص نے یہ چاہا کہ وہ خود کو بیچ کر "استعماری معاہدے" پر اپنے دستخط ثبت کرے تو سب سے پہلے اس نے عمامہ، عبا اور قبا کو ترک کیا، داڑھی مونڈا دی، انگریزی کالر لگایا اور فرنگستان کے سفر پر روانہ ہوا اور دریائے ٹیمز میں بپتسما کا غسل کر کے اپنے وطن واپس آیا، اس طرح وہ نام نہاد آزاد اور آلۂ کار بن کر اس نے ایک متجدد، ترقی پسند، غیر مذہبی یوروپ مآب شخصیت کی حیثیت سے (قرارداد) پر دستخط کیے ہیں۔

یہ مسلمان رہنما اور مفکرین ہی تھے جنھوں نے اور لوگوں سے کہیں زیادہ اپنی مذہبی و عقلی زبان میں اپنی قوم کے لوگوں اور عوام سے (فرنگی مآب روشن فکروں کے برخلاف) تبادلۂ خیالات کیا اور اس خطرہ کا اعلان کیا کہ یوروپ سیسہ، تانبہ، مٹی کا تیل اور روئی کو غارت کر رہا ہے اور معدنی کانوں اور

زمین سے برآمد ہونے والی دوسری چیزوں کو لوٹ کرلے جارہا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسی کے ساتھ ساتھ وہ دولتِ انسانیت، تمدنی سرمایہ، اخلاقی فضایل، روحانی اور مذہبی رسم و رواج، شخصیت، تاریخ اور ہر وہ چیز جو ہمارے ملّی وجود کو ملّی وجود بناتی ہے ان کو بھی غارت کر رہا ہے اور دلدل میں گھسیٹ رہا ہے۔

یہی وہ لوگ تھے جو ملّی تحریکوں کے رہنماؤں کی روش کے برخلاف امپیریلزم کے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔ استعمار کے خلاف ان لوگوں کی جنگ صرف اقتصادی اور سیاسی دائرہ تک محدود نہ تھی بلکہ اس کی بنیاد ایک فکر اور ایک آئیڈیالوجی پر تھی۔ (یہ لوگ) استعمار کو اس کے ہر بھیس میں پہچانتے تھے خاص طور سے اس کے مخفی ترین اور مہیب ترین حملہ آور دستے، یعنی فکری، عقلی، اخلاقی اور علمی دستے جو (استعمار کے) تمدن کے نام سے موسوم ہیں، ان کو ان لوگوں نے پارہ پارہ کر دیا۔

یہ لوگ فکر اور تمدن کے اسلحے سے لیس مغرب کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے جس وقت اقبال مغربی تمدن پر ضرب لگاتے ہیں وہ صرف ایک قوم پرست ہی نہیں ہوتے بلکہ ایشیائی اور افریقی ملکوں پر حادی استعمار کے مخالف بھی ہوتے ہیں، وہ اس لیے مغرب پر حملہ کرتے ہیں کہ "خود" کو استعمار کی سیاسی اور اقتصادی مطلق العنانیت سے نجات دلائیں۔ وہ انسانیت کے ایک رہبر کی حیثیت سے مغرب، اس کی اس تہذیب، تمدن اور فکر پر حملہ کرتے ہیں جو انسانیت کی دشمن ہے، جس کا تمدن یہ چاہتا ہے کہ وہ دوسری اقوام کی تہذیب و تمدن کی نفی کرے، ان کا منکر ہو جائے۔ ان کو ملیامیٹ کر کے رکھ دے۔ اقبال مغرب کے اس نظریے اور اس فکر پر اس لیے حملہ کرتے ہیں کہ وہ اس کو "انسانیت" کے برعکس و برخلاف سمجھتے ہیں۔ یہاں ان کی حیثیت ایک ایسے گرفتار بلا کی نہیں ہے جو خود کو مغرب کی سیاسی قید سے آزاد کرانے اور نجات دلانے کے لیے کوشاں ہو۔

اسلامی معاشرہ میں استعمار اور مغرب کے خلاف ترقی پسند خود شناس، بیدار مصلحوں کے مکاتیبِ فکر جو لڑائی لڑ رہے ہیں اس کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ اس لڑائی کی بنیاد محدود سیاسی اور قومی اغراض پر استوار نہیں ہے بلکہ ایک واضح و روشن اور ارتقا پذیر آفاقیت پر استوار اور ایک بشری فکری بصیرت پر قائم و برقرار ہے۔

آج اوزغان، کاتب یاسین، امہ سزر، علیون دیب، جولیس نریرے اور سنگور جیسے عظیم مفکرین نے جس حقیقت کا ادراک کر لیا ہے اور جن کے فکر کے ترجموں نے ادھر دو تین برسوں میں روشن فکروں کی صفوں میں ایک ہلچل سی مچا دی ہے، (وہی حقیقت) سید جمال الدین کے زمانے سے

لے کر کواکبی اور اقبال کے زمانے تک کے ہمارے خود شناس مفکرین کے لیے بنیادی کار رہی ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ لوگ ہم سے منسوب رہے ہیں، لیکن چونکہ ہم میں سے آدھے لوگ "مومنین مقدسین" ہیں اس لیے "عملیات کے رسالوں" سے آگے قدم نہیں بڑھاتے، ہم کو اپنے مفکرین کی شخصیتوں کو پامال کرنے میں مہارت حاصل ہے (اس بات کی دلیل یہ ہے کہ گذشتہ سو برسوں میں کس محفل یا کس مذہبی اجتماع میں ہم نے سید جمال الدین کا نام لیا ہے ؟) ان کے بارے میں سکوت اختیار کرنے اور دشمنوں کو اس بات کی اجازت دینے میں بھی ہم کو مہارت حاصل ہے کہ ہمارے دشمن ہمارے اپنوں کی شخصیتیں پامال کریں۔ ہم میں سے بقیہ آدھے لوگ غیر مذہبی متجدد ہیں جن کو عرف عام میں روشن فکر کہا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم لوگ (روشن فکر حضرات) انگریزی ترجموں اور ان افکار سے جو یورپ سے ہمارے یہاں وارد ہوئے ہیں، اپنا قدم آگے نہیں بڑھاتے ہم لوگ اپنی مستقل شناخت و امتیاز کی طاقت و قوت سے عاری ہیں۔

اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن جس نے ہر مذہب اور ہر ملت سے کہیں زیادہ استعمار کے چرکے کھائے ہیں، استعمار زدہ معاشروں میں ہر مکتب فکر اور ہر مسلک سے زیادہ استعمار کے خلاف سینہ سپر رہا ہے میں ایک مثال دیتا ہوں:

جس وقت الجزائر اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا اور اس نے ۱۹۶۱ء میں فرانسیسی استعمار کو اکھاڑ پھینکا (میں جو مثال پیش کرنا چاہتا ہوں اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ استعمار کی گرفت سے نکلنے کے سلسلے میں مذہب کی قوت و طاقت کس حد تک اور کن کن پہلوؤں سے ملتوں پر اثر انداز ہوتی ہے) اس وقت فرانس کے انخلا کے بعد جو پہلی پارلیمنٹ اور حکومت بنی اس میں بیشتر غیر مذہبی ممبروں نے حکومت کا کام کاج اپنے ہاتھوں میں لیا۔

۱۹۵۸ء میں جب کہ الجزائر کی جنگ اپنے پورے شباب پر تھی میں فرانس میں تھا، میں نے مجاہدوں سے ہمیشہ اپنا ربط برقرار رکھا اور ان کے مسایل کا بہت نزدیک سے مطالعہ کرتا تھا اور ان تمام حادثوں اور تبدیلیوں سے جو وہاں رونما ہو رہی تھیں، باخبر و نظر مفکرین، اس معاشرہ کی مختلف سماجی، سیاسی اور نظریاتی جماعتوں سے بھی واقف تھا۔ اس وقت جب کہ سات سال کی مسلسل جنگ کے بعد قوم پرست افراد کامیاب ہوگئے تو میں دیکھتا کہ آزادی کی لڑائی لڑنے والے مذہبی عناصر بڑے غم و غصہ کے ساتھ کہا کرتے تھے جو لوگ برسرکار آئے ہیں اور انھوں نے پارلیمنٹ ترتیب دی ہے ان میں اکثریت غیر مذہبی لوگوں کی ہے، صرف یہی نہیں بلکہ ان میں بعض بعض مذہب مخالف لوگ بھی شامل

ہیں۔ اکثریت بائیں بازو کے مذہب مخالف لوگوں کے ساتھ تھی، لیکن یہی غیر مذہبی لوگ جن کی ۱۹۶۱ء کی پہلی پارلیمنٹ میں اکثریت تھی، ان کا سب سے پہلا اقدام اپنی حکومت کا سرکاری نام متعین کرنا تھا۔

پوری دنیا کے تمام روشن فکروں اور "ترقی پسند بازووں" کا جمہوریت، لبرلزم اور آزادی عقاید کی وکالت کرنا ایک مسلمہ اور مشترکہ اصول ہے (ان کے نزدیک) ایک قومی جمہوری ترقی پسند حکومت کو غیر مذہبی حکومت ہونا چاہیے۔

اگر کوئی حکومت اپنے آپ کو کسی خاص مذہب سے وابستہ کر دیتی ہے تو وہ ایک رجعت پسندانہ کام کرتی ہے کیونکہ آج کی دنیا کے مسایل کے بالمقابل مذہبی حکومت کا نظام ازکار رفتہ و فرسودہ ہے حکومت کو ملت کے تمام گروہوں کے تمام بازووں پر اپنا انحصار رکھنا چاہیے۔ جس وقت کوئی حکومت اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ وہ فلاں مذہب سے وابستہ ہے تو یہ ایک جمہوریت مخالف، رجعت پسندانہ فعل ہوتا ہے لیکن انتہائی تعجب کی بات ہے کہ دنیا کے تمام ترقی پسند، ماڈرن افراد کے رویے اور ان کے عام اصول نظر کے بالکل برخلاف انہی بائیں بازو کے غیر مذہبی، سوشلسٹ نمائندوں نے اپنے سیاسی نظام کے لیے جس نام کا انتخاب کیا وہ "اسلامی سوشلسٹ عوامی جمہوریہ" تھا۔

اس سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ الجزائر کو آزادی دلانے والا جو دستہ شدید تغیر و تبدل کا خواہاں اور انتہاپسندانہ بائیں بازو کے خیالات کا حامل تھا وہ طالب علموں کا دستہ تھا۔ فرانسیسی استعمار سے فکری اور مسلحانہ دونوں طرح کی جنگ کرنے میں اس دستہ کا بہت بڑا حصّہ تھا۔ یہ طلبہ الجزائر کے انتہاپسند سوشلسٹ افراد تھے۔

ان لوگوں کا تعلق اس "روشن فکر بائیں بازو" سے نہیں تھا جو ہوٹلوں میں بیئر پی پی کر اپنے جوش و جذبہ کا مظاہرہ کرتے ہیں اور دنیا اور زمانے کو گالیاں دیتے ہیں۔ نہیں، ان لوگوں کی جگہ تو پہاڑوں کے دشوار گذار راستوں پر تھی۔ یہ وہ طلبہ تھے جنھوں نے ۱۹۵۴ء میں پیرس، بروکسل، لندن اور مصر میں اپنے اپنے کلاسوں کو خیرباد کہا اور پہاڑوں پر واپس آگئے، انہوں نے سچ مچ کے اسلحے اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیے اور عملی جنگ میں مصروف ہو گئے۔ ان لوگوں نے اس سوشلزم کا علم، غلط سلط، بے سر و پا اور پراگندہ ترجموں کے ذریعے نہیں حاصل کیا تھا بلکہ یہ لوگ فرانس کی درسیات، معاشرے، مختلف پارٹیوں، ترقی پسند علوم سے بہرہ ور بائیں بازو کے سنڈیکیٹوں اور سوشلزم کے واقعی و حقیقی دبستانوں میں سوشلزم سے آشنا ہوئے تھے اور اسی کے آغوش میں پلے بڑھے تھے، ان طلبہ نے خود کو موسوم کرنے کے لیے جس نام کا انتخاب کیا وہ "انجمن اسلامی دانشجویان

الجزائری" تھا۔

اس سے اہم تر بات یہ تھی کہ الجزائر کی پہلی قومی پارلیمنٹ نے جو بڑھ بڑھ کر حملے کرنے والوں، انقلابیوں، اکثر غیر مذہبی اور تمام کے تمام سوشلسٹ نمائندوں پر مشتمل تھی، اپنے اولین ایام کار میں جو قانون پاس کیا وہ یہ تھا:

"چونکہ الجزائر کا معاشرہ ایک اسلامی معاشرہ ہے اور اسلام میں تمام نشہ آور چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں اس لیے پورے الجزائر میں تمام نشہ آور چیزوں کو حرام قرار دیا جاتا ہے۔" (بعد میں مخصوص اجازت ناموں کے ذریعہ بعض ہوٹلوں اور یوروپین شراب خانوں کو چند مخصوص علاقوں میں بیرونی سیاحوں کے لیے مستثنیٰ قرار دیا گیا)۔

اس اعلان کا مطلب صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو کہ اس زمانے کے اس ملک کے حالات سے واقفیت رکھتا ہے۔ یوروپی استعمار کا ایک کام یہ بھی ہے کہ استعمار زدہ ملک کے زراعتی نظام کو تہس نہس کر کے اس ملک کی تمام زراعتی زمین کو "یک پیداواری" زمین بنا دیتا ہے یعنی وہ ملک جس میں روئی، زیرہ، تنباکو، جو، پھل پھلاری سب ہی کچھ پیدا ہوتا ہو اور اس معاشرہ کی تمام یا زیادہ تر ضرورتیں اپنی ہی زرعی زمینوں سے پوری ہو جاتی ہوں، استعمار اس ملک کی تمام زرعی زمینوں کو اس ملک کی سب سے بہتر صرف ایک پیداوار کے لیے مختص کر دیتا ہے۔

ایشیائی یا افریقی یا لاطینی امریکی ممالک، استعمار کے لیے آزاد خود مختار ممالک نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت شرکت تجار (سنڈیکیٹ) کے ایک فارم (وسیع و عریض کھیت) کی سی ہے۔ اسی وجہ سے جس وقت استعمار یہ دیکھتا ہے کہ فلاں ملک میں زیرہ یا روئی کی کاشت بہت اچھی ہوتی ہے تو وہ اور تمام کھیتوں اور باغوں کو ویران کر دیتا ہے اور تمام زراعتی زمینوں کو زیرہ یا روئی کی کاشت کے لیے استعمال کرتا ہے مثلاً کیوبا کا پورا کا پورا ملک گنے کا کھیت، مصر روئی کا کھیت اور ویت نام کاٹوچو کا کھیت ہو جاتا ہے۔

کسی ملک کو یک پیداواری (یا یک ثقافتی) بنا دینے کے معنی یہی ہیں جو استعماری عمل کی ایک خاص خصوصیت ہے۔ یہ عمل استعمار کے لیے جتنا مفید و سودمند ہے اتنا ہی اس ملک کے لیے مضر اور نقصان دہ ہے اور بہت ساری اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی مشکلات اور پریشانیوں سے دوچار کرتا ہے۔

الجزائر میں تمام زرعی زمینیں "تاکستان" (انگور کے کھیت یا فارم) میں تبدیل کر دی گئی تھیں، وجہ یہ تھی کہ وہاں دھوپ خوب نکلتی ہے اور وہاں کے انگوروں سے اچھی اور وافر مقدار میں شراب حاصل ہوتی ہے۔ الجزائر ایک ایسی سرزمین میں تبدیل ہو گیا جس کی اساسی اور مخصوص پیداوار شراب تھی ـــــ فرانسیسیوں کے لیے۔

وہ الجزائری مسلمان جو شراب نہیں پیتا اور اس کو نجس اور حرام سمجھتا ہے اس کی واحد پیداوار اور تنہا سرمایۂ حیات شراب ہو گئی ہے۔ اب جب کہ انھوں نے فرانسیسیوں کو نکال باہر کیا ہے اور ڈیگال کے دیو کی سینگوں کو توڑ ڈالا ہے، خفیہ فوج کے خطاکاروں کو جو سرمایہ داری اور انہی "نیک نام" جنرل کے ساختہ و پرداختہ تھے، نیست و نابود کر دیا ہے اور اپنی تقدیر کو خود اپنے ہاتھوں سے بنا رہے ہیں (ان باتوں کے باوجود) ان کے پاس شراب کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے، اگر اس شراب کو فرانس نہ خریدے تو اس کو جنگل بیابان میں بہا دینا ہوگا۔

چونکہ سوائے ایک معمولی سی یوروپی الجزائری اقلیت کے ملک میں شراب کا کوئی اور استعمال نہیں کرتا ہے اس لیے حکومت کا کام یہ ہے کہ وہ کروڑوں روپیہ صرف کر کے چند برسوں تک صبر کرے۔ اس وقت تک صبر کرے جب تک انگور کے ان بے انتہا باغوں کو اجاڑ کر متنوع زراعتی آراضی میں تبدیل نہ کر دے۔ اس وقت الجزائر کے پاس اگر کوئی ذریعۂ آمدنی ہے تو وہ صرف شراب کی آمدنی ہے۔ لیکن اس صورت حال کے باوجود وہاں کی حکومت اس پیداوار کو جو اس کی آمدنی کا ذریعہ ہے قانونی طور پر ممنوع قرار دیتی ہے۔

یہ کون لوگ ہیں (جو یہ اقدام کرتے ہیں)؟

یہ وہ لوگ ہیں جن پر ہرگز ہرگز "تقدس مآب" ہونے کی "تہمت" نہیں لگائی جاسکتی۔

یہ کون لوگ ہیں؟

یہ وہ لوگ ہیں جن کی مونچھوں کا ہر تاؤ، ہمارے ان روشن فکر نما، پُر ادعا اور بے سواد حضرات کے لیے جو "چپ"[1] کے فارسی معنی کے مصداق ہیں، سیکڑوں گلے شکووں کا باعث ہے۔

---

[1] عام بول چال میں چپ کے معنی بائیں کے نہیں بلکہ الٹے یا اوندھے کے ہوتے ہیں۔ مصنف کا اشارہ لفظ چپ کے اسی معنی کی طرف ہے یعنی یہ حضرات ترقی پسند روشن فکر نہیں بلکہ چپ بہ معنی فارسی ہیں۔

(مترجم)

پھر آخر کیوں وہ لوگ جو کہ مذہبی افراد نہیں ہیں بلکہ ملّی مجاہد، استعمار مخالف، جمہوریت پسند ہیں۔ وہ لوگ جو عوامی روشن فکر ہیں، تقدس مآب روایتی رجعت پسند نہیں ہیں، کیوں ایک ایسے وقت شراب کا بائیکاٹ کرتے ہیں جب کہ اقتصادی نقطۂ نظر سے تحریم شراب کا اعلان ان کی معیشت کے لیے ایک شدید ضرب کی حیثیت رکھتا ہے؟ کیوں اپنے نظام حکومت کا نام اسلامی نظام حکومت رکھتے ہیں اور کیوں اسلامی تہذیب و تمدن پر تکیہ کرتے ہیں؟ ایسا کیوں ہے؟ اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ یہ لوگ روایت پرست اور رجعت پسند نہیں ہیں۔ ایسا ہونے کا اصل سبب یہ ہے کہ یہ لوگ روشن فکر، جمہوریت پسند، "عوامی اور قوم پرست" لوگ ہیں۔
ان لوگوں کے لیے یہ الفاظ (جمہوریت۔ عوامی۔ قوم پرستی) کوئی معنی رکھتے ہیں اور ہمارے یہاں (ایران میں) یہی الفاظ روشن فکری کے صرف ظاہری اور فیشن پرستانہ پہلو ہی کے حامل ہیں۔

ہمارے سماج میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اِدھر اُدھر سے سن رکھا ہے کہ یورپ میں جو لوگ روشن فکر ہیں وہ مذہبی افراد نہیں ہیں، اسی لیے انہوں نے یہ سوچ رکھا ہے کہ ان کو بھی غیر مذہبی یا مذہب مخالف ہونا چاہیے اور ان کے نزدیک ہر وہ شخص جس نے ہر مذہب اور مذہب کی ہر شکل کی ہمیشہ مخالفت کی ہے، ایک یورپی مفکر بن جاتا ہے۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ میں نے کوئی نظریہ بیان کیا جو دانش وری کے بنیادی عناصر میں سے ایک ہے، لیکن انھوں نے اس نظریہ کو نہ پڑھا ہے، نہ سنا ہے نہ ہی سمجھا ہے مگر صرف اس وجہ سے اس کی مخالفت کرتے ہیں کہ اس نظریہ میں اسلام کا نام لیا گیا ہے یا ان کے اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے سن رکھا ہے کہ میرا ذہنی جھکاؤ مذہب کی طرف ہے، ایسے لوگوں نے میری کتابوں کی صرف جلدیں ہی دیکھ کر ان کو رد کر دیا ہے۔

یہ لوگ ہمارے ان متعصب مذہبی حضرات کی پوری پوری شبیہ ہیں جو میری تمام باتوں کے بارے میں میرے لباس اور ظاہری حلیے کو مدنظر رکھتے ہوئے حکم لگاتے ہیں اور صرف اس وجہ سے کہ وہ داڑھی رکھتے ہیں، اپنے آپ کو اس کا اہل سمجھتے ہیں کہ میرے خلاف فتویٰ صادر کریں۔ میں جو کچھ کہتا ہوں اس کو نہ تو وہ سمجھتے ہیں اور نہ ہی ان کے اندر اتنی صلاحیت ہے کہ وہ میری لکھی باتوں کو صحیح صحیح پڑھ سکیں پھر بھی وہ میری باتوں کی تردید کرتے ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ میں ان دونوں گروہوں کو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے کہتا ہوں ان دونوں

گروہوں نے جو دھوکا دینے والے عنوانات اپنے لیے مخصوص کرلیے ہیں اُن سے فریب نہیں کھانا چاہیے سب سے زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ ایک "روشن فکر" حضرت تھے جو میری باتوں کو رد تو نہ کرسکے اور چاروناچار میری باتوں کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے مگر فرمانے لگے:

"تمہاری یہ بات تو صحیح ہے کہ اگر ہم اپنے تمدن وتہذیب اور فکر اسلامی کے ترقی پسند عناصر کی طرف مراجعت کرتے ہیں تو ہمارے معاشرے کی کایا پلٹ ہوجاتی ہے اور وہ ایک خود مختارانہ کردار کا حامل بن جاتا ہے جب تم یہ کہتے ہو کہ خرافات سے مخلوط ہوجانے کے بعد مذہب اسلام کی شکل مسخ ہوگئی ہے تو یہ بات بھی تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ تمہارا یہ کہنا کہ حقیقی اسلام ایک حیات بخش، اجتماعی، آگاہی بخش اور ترقی پسند مذہب ہے اور اگر اس مذہب کی وہ روح اور وہ معنویت جو اب بھی ہمارے درمیان موجود ہے اگر اس کا احیا ہوجائے تو ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ ہم مغرب کے حملوں کا مقابلہ کرسکیں اور معنوی وانسانی آزادی وخود مختاری بھی حاصل کرسکیں اور ہمارے عوام جو کہ مذہبی لوگ ہیں ان کو اسی قوت وطاقت (اسلام) کے ذریعہ ہم بیدار و متحرک رکھ سکیں گے، اس بات کو بھی میں صحیح سمجھتا ہوں اور تسلیم کرتا ہوں کہ مذہب اسلام ایک حقیقت ہے ایک ایسی حقیقت جو ہمارے لیے لازم بھی ہے مفید بھی اور ہماری تمام احتیاجات کے مطابق بھی۔ مگر ہم لوگ کب تک آج کے مخلوط اسلام اور اس کے انحرافی افکار کو مسترد کرتے جائیں گے اور حقیقی اسلام کا احیاء کریں گے؟ یہ کام بہت مشکل ہے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم مذہب سے صرفِ نظر کرلیں اور دین کو اٹھا کر ایک کنارے ڈال دیں۔ جب ہم یہ کرچکیں گے تو راہ صاف ہو جائے گی پھر ہم اپنے عوام سے کہہ سکیں گے کہ دیکھو راستہ یہ ہے اور کنواں یہ ——"

میں نے اس سے کہا یہ دشواری کہ یہ کام مشکل ہے اس بات کا سبب نہیں بنتی کہ ہم اس کو (مذہب کو) چھوڑ دیں۔ اگر تم یہ کہتے ہو کہ اسلام سچا اور حقیقی مذہب ہے، ایک ترقی پسند، ارفع و اعلیٰ

اور واقعی فکر کا حامل ہے تو خود بخود اس کے معتقد ہو جاتے ہو۔ اسی بات (اسلام کی حقانیت) کا سمجھنا مشکل ہے، خواہ وہ قابل عمل ہو یا نہ ہو۔

میں تو یہ نہیں کر سکتا کہ کہوں جناب عالی! میرا ایک دین اور ایک مکتب فکر ہے جو سچا اور اور واقعی و علمی حقیقت پر مبنی ہے مگر میں اس کو اس لیے قبول نہیں کرتا بلکہ رد کرتا ہوں کہ آج کی دنیا اور آج کے معاشرہ میں اس کا احیا اور اس کو جاری و ساری کرنا مشکل بھی ہے اور طول عمل بھی۔ میں مجبور ہو کر سرے سے اس کا انکار کرتا ہوں اور ایک دوسری فکر اور ایک دوسرے اعتقادی مکتب کا پیرو کار بنتا ہوں، جو آسان ہے اور اس کو بہت جلد (معاشرہ میں) رائج بھی کیا جا سکتا ہے۔

وہ شخص مجھ سے یہ کہتا ہے ــــ "اس بیسویں صدی میں جو کہ بے دینی کی صدی ہے کیا مذہبی طریقے سے عوام اور ملت کی خدمت، معاشرہ کی اصلاح اور معاشرتی طور وطریق میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے اور کیا لوگوں کی فکر کو بیدار کیا جا سکتا ہے؟

کتنی حیرت کا مقام ہے، یہ کیا اشتباہ ہے؟ بیسویں صدی کا ہم سے کیا تعلق؟ ہمارے روشن فکر حضرات "تقویمی زمانے" اور "معاشرتی زمانے" کو ایک ہی زمانہ سمجھ رہے ہیں۔ تقویمی نقطۂ نظر سے وہ تمام انسان جو اس زمانے میں سانس لے رہے ہیں ایک دوسرے کے معاصر ہیں، بیسویں صدی میں زندہ ہیں مگر (معاشرتی اعتبار سے) یہ تمام کے تمام افراد بیسویں صدی میں زندگی نہیں بسر کر رہے ہیں۔

ایک حقیقی اور واقعی (نہ کہ آنکھیں میچ کر ترجمہ کرنے والے) روشن فکر شخص کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ وہ اپنے معاشرہ کے "معاشری زمانے" کو متعین کرے، یعنی وہ اس بات کو سمجھے کہ اس کا معاشرہ کس تاریخی مرحلے اور کس صدی میں زندگی بسر کر رہا ہے؟ اس بیسویں صدی میں بہت سے معاشرے ایسے بھی ہیں جو ابھی تاریخی دور میں داخل ہی نہیں ہوئے ہیں بلکہ زمانۂ ماقبل تاریخ میں اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

ایک ایسا معاشرہ جس میں ابھی تک جاگیرداری طریقہ (فیوڈلزم) رائج ہے، اس میں اب بھی عمومی ناخواندگی موجود ہے، کوئی اساسی قانون نہیں ہے نہ ہی اس کا معاشری ڈھانچہ جمہوری اور ترقی پسندانہ ہے مگر اس کا وجود بیسویں صدی میں ہے (اس معاشرے کے سلسلہ میں) بیورو کریسی، جمہوریت، مشین ازم، سرمایہ داری، پرولتاریہ طبقہ، لبرل ازم، بورژوازی، انسانیت دوستی، بین الاقوامیت، فضول فلسفہ، فلسفیوں کی غلطیاں، آفاقی معاشرہ وغیرہ کی باتیں کرنا جو خالص

بیسویں صدی عیسوی کے معاشرہ کے مسایل ہیں، کس قدر احمقانہ بات ہے؟

ایرانی روشن فکر اس بات سے واقف ہے کہ بیسویں صدی جس سے سو سال پہلے انیسویں صدی تھی (اس انیسویں صدی) کے یوروپی معاشرہ میں ہیگل اور نٹشے تھے، سوشلزم کی تحریک تھی، پرودھن اور سینٹ سائمن تھے، مارکس اور اینگلز تھے۔ یوروپ کے اٹھارہویں صدی کے معاشرہ میں فرانس کا عظیم انقلاب ہوا، انگلستان میں صنعتی انقلاب آیا، اسی معاشرہ میں والیٹر اور روسو بھی تھے اور دائرۃ المعارف بھی۔ سولہویں اور پندرہویں صدیوں میں نشاۃ الثانیہ کی عظیم تحریک تھی اور گلیلیو اور کوپرنیک کا (پیدا کردہ) عظیم فکری انقلاب۔

لیکن سو سال پہلے ٹھیک اسی زمانے میں جب کہ یوروپ میں پرودھن اور مارکس تھے، دستور العمل بن رہا تھا اور مزدوروں کی تحریک چل رہی تھی۔ اس کے (ایرانی) معاشرہ میں شیخیہ، بابی اور بہائی تحریکیں چل رہی تھیں۔ بابیوں کی بغاوت ہو رہی تھی اور ہمارے پاس صرف بہاء اللہ کی "مقدس" کتابیں ہی تھیں (جو ساری کی ساری بدعتیں تھیں[۱])

سترہویں صدی عیسوی میں ہمارے پاس صفویوں کی مذہبی اور ملی تحریک تھی، اس عہد کی عظیم فلسفیانہ تحریک تھی، اس سے پہلے کی صدیوں میں ہم جس قدر بھی پیچھے کی طرف مڑتے چلے جائیں گے ہم نور و تابانی، تہذیب و تمدن اور انسانی شرف و منزلت کا نظارا کریں گے۔ میرے معاشرہ کی انفرادی تاریخ یوروپی معاشرہ کی تاریخ کے مقابلے میں معکوس سمت کی حامل نظر آئے گی۔

(یوروپی معاشرہ قرونِ وسطیٰ کے عہد سے نکل کر تہذیب و تمدن اور علم و عقل کے زرّیں عہد میں داخل ہوا، اور ہم اپنے عہدِ زرّیں سے نکل کر گھور اندھیارے، مرگ آور اور گلا گھونٹ دینے والے قرونِ وسطائی عہد میں داخل ہو گئے[۲]۔)

بیسویں صدی کا معاشرہ، میں صرف اپنے معاشرہ سے سروکار رکھتا ہوں، مجھ روشن فکر کو یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ میں نہ تو انیسویں صدی کے جرمنی میں ہوں اور نہ بیسویں صدی کے فرانس میں اور نہ ہی پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی کے اٹلی میں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں مشہد، تہران، تبریز، قم اور خوزستان میں اپنی زندگی بسر کر رہا ہوں۔

---

[۱] یہاں بھی چاپ امریکا اور چاپ ہند کے متون میں اختلاف ہے۔ ترجمہ چاپ ہند کے مطابق کیا گیا ہے۔ (مترجم)

[۲] چاپ ہند میں یہ جملہ نہیں ہے۔ (مترجم)

حقیقت پسند ہونے کے معنی یہی ہیں، یعنی معاشری نتائج کو دنیا کے روشن فکروں کی تالیفات اور تصنیفات کی روشنی میں اخذ نہیں کرنا چاہیے بلکہ عوام الناس کو سامنے رکھ کر معاشری نتائج پر پہنچنا چاہیے۔ اس طرح کے نتیجے کتابوں کے متون پڑھ کر نہیں بلکہ عوام الناس کے متون پڑھ کر اخذ کرنا چاہیے۔ مجھے اس بات سے کیا سروکار کہ یہ عہد "غیر مذہبیت" کا عہد ہے، (کیونکہ) میرا معاشرہ تو ایک مذہبی معاشرہ ہے۔ میں مذہبی فرد ہوں خواہ غیر مذہبی (انفرادی فلسفیانہ نقطۂ نظر سے)۔ اگر میں روشن فکر ہوں تو مجھ کو اس سماجی اور اجتماعی حقیقت کا معترف ہونا چاہیے کہ (میرا معاشرہ ایک مذہبی معاشرہ ہے)

ہمارے بہت سے روشن فکر، اجتماعی واقعیت وحقیقت میں اپنے انفرادی عقاید ملا دیتے ہیں، چونکہ وہ لوگ خود مذہب مخالف ہیں اس لیے وہ لوگ اپنی اجتماعی اور سیاسی تصنیفات وتالیفات میں معاشرہ کو بھی مذہب مخالف فرض کر لیتے ہیں! حقیقی روشن فکر وہی ہے جو آئیڈیالسٹ نہ ہو یعنی وہ معاشرہ کے واقعی وحقیقی افکار ونظریات کو اپنے ذہنی اور درونی افکار ونظریات کی عینک سے نہ دیکھے (بلکہ وہ جس طرح اور جس رنگ میں ہوں ان کو اسی طرح پیش کرے)

میں دیکھ رہا ہوں کہ میری ملت کی اجتماعی روح مذہبی ہے اور میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ استعمار اور اس کے عوامل اس (مذہبی روح) پر تکیہ کرتے ہیں اور کبھی شدت کے ساتھ اس سے آمادۂ پیکار ہو جاتے ہیں۔

استعمار کی بنیاد رکھنے والے انگریز نے قرآن کو زمین پر پٹخا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا کہ جب تک اس کتاب کا وجود باقی ہے، مسلمانوں میں ہمارا نفوذ کرنا محال ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ ایک ترقی پسند روشن فکر کو اپنے معاشرہ کی تہذیب وتمدن، اس کی روح اور شخصیت پر تکیہ کرنا چاہیے اور اسی بنیاد پر اپنی تحریک کا آغاز کرنا چاہیے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہمارا ملی تمدن اور تہذیب، اسلامی تمدن وتہذیب ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اسلام (خواہ میں مذہب کو مانوں خواہ نہ مانوں) اجتماعی، سیاسی غیر طبقاتی، اس دنیا پر بصیرت افروز نظر ڈالنے والا اور ستیزہ کار تہذیب وتمدن کے عناصر سے مالا مال ہے۔

چونکہ میرے معاشرہ میں اسلام ہی عوام کا عقیدہ بھی ہے اور قوی ترین اجتماعی قوت بھی۔ اسلام ہی میرے معاشرہ کی تاریخ ہے اور ملی تہذیب وتمدن بھی۔ اسلام ہی عوام الناس کی ذات کو بیدار، با انصاف، استبداد مخالف بنانے والا ہے اور اپنے پیروؤں کو انسانی، اجتماعی اور مادی عزت

بخشنے والا بھی - اس واقعیت و حقیقت کو نہ سمجھنا، کچھ بھی نہ سمجھنے کے مترادف ہے - اگر میں روشن فکر اس بھرپور اور عظیم تہذیب و تمدن کے منبع کا استخراج کرسکوں، اگر ان لوگوں کو جوکہ اسلام پر ایمان و اعتقاد رکھتے ہیں، اسلام سے آگاہ و آشنا کرسکوں - اسلام کی وہ تاریخ جوکہ جہد و ستیز سے معمور ہے، اسلام کا وہ دبستان جو زندگی کے شعور اور حرکت سے عبارت ہے، اگر میں ان لوگوں کے دلوں کی طرح ان کی نگاہوں پر بھی آشکار کردوں تو پھر یہ کہا جاسکتا ہے کہ میں نے ایک روشن فکر کی حیثیت سے اپنے فریضہ کو انجام دے دیا ہے - روشن فکر کا بجز اس کے کوئی اور فریضہ نہیں ہے کہ وہ کسی معاشرہ کی تہذیب و تمدن اور اس کی معنوی و ملّی شخصیت کی اساس پر (اُس معاشرہ کے لوگوں کو) ان کی ملّی اور طبقاتی (اصلیت) سے آگاہ کرادے - (جہاں تک سیاسی رہبری کا سوال ہے) یہ خود عوام کا کام ہے (اور روشن فکر اس رہبری سے بری الذمہ ہے)

ملاحظہ فرمایئے ان خود غرض روشن فکروں نے ہم کو کیا بنا دیا ہے - جس وقت میں ابوذرؓ کی بات کرتا ہوں جو طبقاتی تصور کے خلاف جنگ کرنے والوں میں ترقی پسند ترین فرد تھے اور جن کو موجودہ زمانے کے واقعی اور علمی معنوں میں "انقلابی" کہا جاسکتا ہے (یہ وہ شخص تھے جنہوں نے تاریخ اور مذہب (دونوں کے میدانوں میں) سرمایہ داری اور استبداد کے خلاف جد و جہد کا آغاز کیا تھا - جب میں علیؓ کی بات کرتا ہوں جو کہ آزادی، انسانی بہادری، عدل و انصاف کے مظہر ہیں - مکر و فریب اور مذہب سے غلط فائدہ اٹھانے کے خلاف ایک انقلابی جنگجو کی حیثیت رکھتے ہیں - (اسی کے ساتھ ساتھ) وہ حریت، بہادری، جانبازی اور فکر و احساس کا سرچشمۂ الہام بھی ہیں، تو یہ نام نہاد روشن فکر اپنے سر کو ہلاتا ہوا کہتا ہے ——— "ہاں! یہ مذہبی اور فرسودہ باتیں ہیں" (یہ روشن فکر والٹیر کی تقلید کرتا ہے جس نے ایک پادری کے جواب میں حضرت عیسٰیؑ کے گدھے کی لید کے پاک ہونے کے سلسلے میں باتیں کی ہیں[1]) پھر یہی روشن فکر اُس تیر انداز آرش کی باتیں کرتا ہے جس نے ایران کی سرزمین کی توسیع کے لیے اتنی زور سے تیر چلایا کہ خود ہی نابود ہوگیا - یہی روشن فکر رستم دستاں، سیمرغ، تہمینہ، اشکبوس، کیکاؤس، سفید دیو اور رستم کے ہفت خواں کی باتیں کرتا ہے اور بزعم خود یہ سمجھتا ہے کہ اس نے ایک ترقی پسندانہ کام کیا ہے، ستیزہ کاری کی روح کی نشان دہی کی ہے اور اس طرح ملّی، قومی اور خود آگاہانہ بیداری کو عالم وجود میں لایا ہے -

---

[1] چاپ ہند میں یہ جملہ یوں ہے " ...... از پاکئی خونِ حضرت عیسٰی حرف می زند" (مترجم)

میں فلسفۂ مذہب کی حقانیت کے بارے میں گفتگو نہیں کر رہا ہوں بلکہ صرف معاشرتی نقطۂ نظر سے باتیں کر رہا ہوں - کیا عصر حاضر کے ہمارے عوام حضرت ابوذرؓ کی ستیزہ کاری سے اپنا ایمان تازہ کرتے ہیں اور حضرت علیؓ کی بہادری، عدل و انصاف کے ذریعہ اپنی شناخت تک رسائی حاصل کرتے ہیں یا زال اور زریر کے قصوں سے ؟ حضرت زینبؓ کی شخصیت ان کو آزادی (حاصل کرنے) اور ظلم و ستم کے خلاف بغاوت کرنے کا سبق دیتی ہے یا گرد آفرید کی شخصیت ؟

میں اساطیر کی قدر و قیمت کا منکر نہیں ہوں، لیکن میرا کہنا یہ ہے کہ جب آپ روشن فکر حضرات، اساطیر اور تقریباً فراموش شدہ، دور از کار موہوم افسانوں کے اس لیے معتقد ہیں کہ ان کے ذریعے ملت کو بیدار اور معاشرتی لحاظ سے خود آگاہ کیا جا سکتا ہے تو پھر آپ ان واضح، روشن، ولولہ انگیز اور عوام کے دلوں میں رچے بسے تاریخی واقعات کی قدر و قیمت کے منکر کیوں ہیں اور اس بات کے لیے کیوں کوشاں ہیں کہ ان تاریخی واقعات کو اٹھا کر کہیں دور پھینک دیں۔

یہ تعلیمات (تاریخی واقعات کی تعلیمات) نہ تو انسان کو ذلیل و خوار کرنے والی تعلیمات ہیں، اور نہ ہی اس کو احساس ذمہ داری سے عاری کرنے والی بلکہ یہ تعلیمات انسان کو انسان بنانے والی اور اس کو قوت و طاقت بخشنے والی تعلیمات ہیں - یہ کتنی احمقانہ اور جاہلانہ بات ہے کہ ہم اس مذہب کے نقوش کو جس پر معاشرہ اور استعمار کے خلاف جنگ کرنے کی وجہ سے "تلوار کا مذہب" ہونے کا اتہام ہے اور اس مذہب کے نقوش کو جو صلح کل، زہد اور گوشہ نشینی کا طالب ہے، ایک ہی نوع کے نقوش سمجھیں، اور ان نقوش کے حق و باطل ہونے کے سلسلے میں کوئی بحث و مباحثہ نہ کریں۔

اگر ہم معاشرہ کے نوشتۂ تقدیر پر کوئی اعتقاد رکھتے ہیں تو اس معاشرہ کو بیدار کرنے اور اس مذہب کو ماننے والی امت کے قالب نیم مردہ میں زندگی کی رمق اور حرکت پیدا کرنے اور اس عامل کو جس نے عوام کو اسلام اور دین کے نام پر پتھر کا انسان بنا دیا ہے، متحرک اور ارتقا پذیر بنانے کا واحد راستہ یہی ہے کہ ہم بھی اس سماج میں اسی راہ سے نفوذ کریں جس راہ سے استعمار نے اس سماج میں نفوذ کیا ہے اور ہم بھی انہی تمام طریقوں پر عمل کریں جس پر عمل کرنے کا استبداد اور رجعت پسندی نے تجربہ کیا ہے اور دونوں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان دونوں نے کیا کیا ؟

حضرت علیؓ نے دین کی جو تعبیر کی تھی ان دونوں (استبداد اور رجعت پسندی) نے اس کو یکسر الٹ دیا۔ اسلام میں دشمن کے خلاف جہاد کرنے کا جو تصور ہے اس کو بودھوں اور عیسائیوں کی طرح صرف نفس سے جہاد کرنے میں تبدیل کر دیا۔ یہاں تک کہ حضرت حسینؓ کے انقلابی اور خون کو

جوش میں لانے والے واقعہ کو بھی ان لوگوں نے ایک سلا دینے اور بے حس کر دینے والے افیونی مادہ میں بدل کر رکھ دیا۔

اگر روشن فکر حضرات یہ بات صحیح کہتے ہیں کہ عوام کے خلاف مذہب کو استعمار استبداد اور رجعت پسندی اسلحے فراہم کرتی ہے تو پھر آپ حضرات عوام کے فائدے کے لیے مذہب سے یہ اسلحے چھین لیجیے۔ دشمن کو کس طرح اسلحے سے محروم کیا جاتا ہے؟

آیا ترک اسلحہ اور عوام میں اسلحے کی قدر و قیمت اور ان کے فوائد کی نفی کر کے یا دشمن کے ہاتھوں سے اسلحہ چھین کر کے دوست کے سپرد کر دینے سے؟

اسلامی معاشروں میں، مذہب کے خلاف روشن فکروں کی بغاوت و جنگ نے خطاکاروں رجعت پسندوں اور عوام کو فریب دینے والے دشمنوں کی سب سے زیادہ خدمت گزاری کی ہے۔ ان لوگوں کی مخالفت سے مذہبی عوام تو اپنے دین سے دست بردار نہیں ہوئے مگر وہ لوگ جو کہ اپنے کو دین کے پاسدار کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں اور اپنے وضع و طریق کو دین سے تطبیق دینے کے مدعی ہیں وہ ضرور ان کے زیر سایہ محکم و مضبوط ہو جاتے ہیں اور جب روشن فکری، عدل و انصاف اور آزادی کی تحریک کا حملہ ہوتا ہے تو انہی کے دست و بازو اور قوی ہو جاتے ہیں۔

ہمارے معاشرہ کے روشن فکر حضرات کو ان دو بنیادی باتوں کا علم ہونا ضروری ہے۔ اول تو یہ کہ ہمارا معاشرہ اسلامی معاشرہ ہے۔ دویم یہ کہ اسلام ایک متحرک اور اجتماعی رزمیہ ہے۔ اگر کوئی مفکر ہمارے عوام کی بیداری، خود آگاہی، تمدنی اور معاشرتی پختہ کاری کے لیے کوئی تحریک چلاتا ہے اور اپنی تحریک کی بنیاد انہی دو نکات پر رکھتا ہے تو اس کو بہت جلد اور یقینی کامیابی حاصل ہوگی۔

سید جمال الدین پر نگاہ ڈالیے، ایک کوردہ علاقے کا گمنام سید، ہمدان کے مقام سدا باد سے آتا ہے، اس کا تعلق نہ کسی طبقہ سے ہے اور نہ کسی (مخصوص) خانوادہ سے، نہ کسی سیاسی جماعت اور گروہ سے۔ وہ بے خان و مان ایک فوٹ بال کی طرح اس ملک سے اُس ملک میں لڑھکتا پھرتا ہے یہ اس زمانے کی بات ہے جب مغربی استعمار اپنے پورے عروج پر تھا اور ساری دنیا اس کے زیر نگیں تھی، مشرق کا عالم یہ تھا کہ وہ خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ مزید برآں سید جمال جن اسلامی معاشروں میں بے خان و مان گھوم رہے تھے، یہ وہ اسلامی معاشرے تھے جن میں سے ہر ایک میں ناصر الدین شاہ جیسے نام نہاد حکمراں، حاکم تھے، سید جمال نے تن تنہا صدائے فریاد بلند کی، وہ

فریادِ صور اسرافیل کے مانند تھی جس کی وجہ سے مسلمان ملتوں نے اپنے اپنے کفن پھاڑ ڈالے اور سکوت و انجماد کے قبرستان سے نکل کر آمادۂ بغاوت ہو گئے۔

ان کو یہ طاقت و قوت اور نفوذ کی قدرت کہاں سے ملی ؟ وہ کون سا عامل تھا جس کی بنا پر اس ایک تنہا شخص کی آواز لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں میں بھی اُتر گئی اور فضائے عالم پر بھی چھا گئی ؟ کیا اس بات کے علاوہ بھی کوئی اور بات تھی کہ مسلمان ملتوں نے اس آواز کو اپنے ایک آشنا کی صدائے دعوت سمجھا ؟

لوگوں نے محسوس کیا کہ یہ آواز خود انہی کی تہذیب و تمدن کی روح، قابلِ فخر و مباہات تاریخ، ان کی زندگی اور ان کی نبرد آزمائیوں کی گہرائیوں سے آ رہی ہے۔

یہ کوئی نامانوس آواز نہیں ہے۔ نہ ہی یہ آواز بیرونی دنیا کے مفکرین کے افکار کی صدائے بازگشت ہے، بلکہ یہ آواز تو اس پکار کا ایک عکس ہے جو غارِ حرا میں، مکہ اور مدینہ میں، جنگ احد و قادسیہ میں، بیت المقدس اور جبل الطارق میں، صلیبی جنگوں میں گونجی تھی۔ یہ وہی آواز ہے جو زندگی عطا کرنے والی بھی ہے اور جہاد، عزتِ نفس اور قوت و طاقت کی دعوت دینے والی بھی۔ یہ وہی آواز ہے جو اسلام کی نبرد آزمائیوں کا ترانہ سناتی ہوئی تاریخ عالم کے کانوں میں گونجتی رہی ہے۔

یہ آواز اپنی اصلیت اور فکری ماہیت کے لحاظ سے صرف مسلمانوں کے احساس کی آواز ہے اور اس میں کسی ناآشنا کی آواز شامل نہیں ہے۔ یہ آواز طمانیت قلب بخشنے والی بھی ہے اور خیال انگیز بھی۔ اسی وجہ سے اس آواز کو ہر شخص نے اپنے دل کی گہرائیوں سے سنا۔ وہ روشن فکر جو اپنے تہذیب و تمدن، تاریخ اور ملت کی زبان سے آشنا ہوتا ہے اس کی آواز اور پکار ایسی ہی ہوتی ہے۔

یہی وہ آشنائی ہے جو زمانے اور تقدیر کے حاکموں کی قدرت و طاقت کے علی الرغم روشن فکروں کو قوت و طاقت اور کامیابی کا امکان عطا کرتی ہے۔ مذہب کی یہ عظیم الشان طاقت کسی بھی اسلامی معاشرہ میں بڑی آسانی کے ساتھ ایک ایسی قوت و طاقت میں تبدیل ہو سکتی ہے، جو انسان کو انسان بنانے والی اور آگاہی بخشنے والی قوت ہوتی ہے۔ اگر ہمارے روشن فکر حضرات اس بات سے واقف ہوں گے (اور اس کا ادراک رکھتے ہوں گے) تو ان کو معلوم ہو گا کہ) اسلامی تعلیمات ایک باطنی و فردی رہبانیت، زندگی سے کٹی ہوئی اور صرف مادی معاشرہ سے تعلق رکھنے والی تعلیمات نہیں ہیں بلکہ اس کی تعلیمات جہادی، سیاسی اور اجتماعی ہیں اور ان تعلیمات کی بنیادیں تمام افراد کی ذمہ داریوں، عزتِ (نفس) قدرت (وطاقت) حکومت اور رہبری پر استوار ہیں۔ ان تعلیمات کا جھکاؤ دنیا کی طرف ہے، یہ تمام مذہبوں کا آخری آئیڈیل

ہیں۔ لیکن اسلام میں آخرت کا جو تصور ہے وہ اس دنیا کی زندگی ہی کا ایک عکس ہے۔ پوری کی پوری دنیا آخرت پر مقدم ہے۔ آخرت، دنیا کی منطقی علیت اور معلولیت کے سوا کچھ اور نہیں ہے دولت کا نظم ونسق اصل چیز ہے۔ معاد تو صرف انہی ملتوں کے لیے ہے جن کے پاس معاش کے ذرائع موجود ہیں "وہ شخص جو کہ کھانے پینے کی چیزوں سے محروم ہے، بھوکا ہے اس کو چاہیے کہ وہ شمشیر برہنہ لے کر سب لوگوں پر ٹوٹ پڑے کیونکہ تمام کے تمام ہی لوگ اس کی بھوک کے ذمہ دار ہیں" (حضرت ابوذرؓ)

اسلام اشرافیہ کا مخالف اور ناس (عوام) کا مذہب ہے وہ حکمران طبقہ سے امیروں، رئیسوں سے حتیٰ کہ ان روحانی لوگوں (احباروں اور راہبوں) سے بھی ناقابل صلح جنگ کرتا ہے جو تمام معاشروں اور تمام گذشتہ مذہبوں میں حکمران طبقہ ہی کا ایک جزو تھے۔ اسلام کا آخری ہدف یہ ہے کہ وہ عدل و انصاف کو برقرار کرے اور دنیا کے تمام انسانوں کو ایک دوسرے کے برابر قرار دے۔ (لیقوم الناس بالقسط[1]) تاریخ اسلام کا فلسفہ یہ ہے کہ محکوم، اسیر اور کمزور عوام کو قطعی آزادی دلائے اور روئے زمین پر ان کی حکومت قائم کرے۔ "و نرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلہم ائمۃ ونجعلہم الوارثین[2]"

وہ دین جس کے رہبروں اور برجستہ ترین شخصیتوں نے میدان جنگ یا قید خانوں کی تنگ و تار کوٹھریوں میں اپنی جانیں جان آفرین کے سپرد کی ہیں، اس میں اور اس دین میں بڑا فرق ہے جس کے مقدس لوگوں نے معابد اور پہاڑوں کے غاروں میں اپنی زندگیوں میں دیمک لگادی ہے۔

افسوس ہے کہ اس فرق و امتیاز کو نہ تو ہمارے روشن فکر حضرات سمجھتے ہیں اور نہ ہی ہمارے وہ افراد جو مذہب کے نمائندے ہیں۔ یہ لوگ اسلام کی شناخت جس چیز سے کرتے ہیں وہ اسلام سے مشابہ ضرور ہے مگر اصل اسلام نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "من لا معاش لہ لا معاد لہ" جس فرد کی مادی زندگی

---

[1] تاکہ لوگ عدل و انصاف سے کام لیں۔

[2] اور ارادہ کرتے تھے ہم یہ کہ ان لوگوں پر احسان کریں جو ناتوان کیے گیے تھے زمین میں۔ اور کریں ان کو پیشوا زمین میں اور کریں ان کو وارث ملک کے (سورۃ قصص)

نہیں ہے اس کی آخری زندگی بھی نہیں ہے۔ آپ ہی کا ایک اور ارشاد ہے" کاد الفقر ان یکون کفرا" یعنی فقر، کفر کا دیوار بہ دیوار ہمسایہ ہے۔

حضرت ابوذرؓ کا قول ہے" جس وقت (کسی شخص کے یہاں) فقر ایک دروازے سے داخل ہوتا ہے، دین دوسرے دروازے سے باہر چلا جاتا ہے۔ یہ مذہب، سعدی کے اس صوفیانہ مذہب سے بالکل الگ ہے جس کے بارے میں سعدی کا قول ہے" اندرون از طعام خالی دار" (شکم کھانے سے خالی رکھو) کیا آپ کو علم ہے کہ آپ ایسے مذہب میں کیا دیکھ سکیں گے؟ کچھ بھی نہیں! (اگر کچھ دیکھ بھی سکیں گے تو) وہ صرف خالی آنتوں اور معدہ میں قراقر کرتی ہوئی ریاح کی آواز ہوگی۔

مذکورہ بالا مسایل اور اسلامی، اجتماعی، سیاسی اور تمدنی بصیرت کی بنیادوں پر ہی اقبال کے کاموں کی عظمت ظاہر ہوگی۔ انہوں نے مغرب کو بہت نزدیک سے دیکھا اور اس کے تہذیب وتمدن، معاشرہ اور تاریخ سے بہت گہری، پائدار، ہمہ جانبہ واقفیت بہم پہنچائی۔ پھر بھی غرب زدگی کی قید سے اپنے آپ کو نجات دلاتے رکھا۔

غرب زدگی سے جنگ کرنے کا ایک راستہ یہ بھی ہے کہ واقعی اور حقیقی مغرب کو اچھی طرح شناخت کر لیا جائے۔ یہ حضرات جو فرنگی مآبی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور یوروپی تہذیب وتمدن پر والہ وشیدا ہیں، وہ لوگ ہیں جو مغرب کو محرمانہ، درست طور اور نزدیک سے نہیں جانتے پہچانتے ان کی مثال بالکل ان رجعت پسند متعصب اور قدامت پرست افراد جیسی ہے جو مغرب اور اس کے تہذیب وتمدن سے کلیتاً اختلاف کرتے ہیں اور فرنگی حضرات کے قول کے مطابق ایک نظام العمل کے طور پر مغرب کے مخالف ہیں۔

اقبال نے مغرب میں اپنے آپ کو آج کی دنیا کی فکر وفلسفہ کی بلندترین چوٹی تک پہنچایا۔ یوروپ کے علم اور اس کی جدید تکنیک کی قدر وقیمت کو بخوبی سمجھا۔ اقبال ایران اور ایران کے تہذیب وتمدن سے بھی آشنا ہوئے اور وہ معنویت، لطافت، روح، ظرافت، بصیرت کی گہرائی جو اسلامی ایرانی تہذیب وتمدن کا خاصہ ہے اور خاص طور سے ایران کے ادبیات میں جن کے جلوے عام ہیں، ان کو انھوں نے اپنے اندر سمو لیا۔

اس کے علاوہ فکر اقبال کی جو روح ہے وہ ان کی قومی فکر سے ماخوذ ہے۔ یہ وہ فکر ہے جو تاریخ کے طویل ترین ادوار میں، دقتِ احساس، نازکیٔ خیال، روح کی پاکیزگی، دل کی معنویت، مشرقیت اور الہام سے عبارت ہے اور اقبال کی نسلی اور تمدنی خصوصیات کی حامل ہے۔ اقبال نے ہندستان میں

اس کے عظیم معنوی سرمایے اور اسلام کی اس عظمت و رفعت، اور روح و بصیرت کے درمیان آنکھ کھولی اور اس بات کی طاقت و توانائی پائی کہ اسلام کے فکری مکتب کے درہم برہم شدہ اجزا کو یک جا کریں اور اس کی از سر نو "تجدید بنا" کریں۔

محمد اقبال کی شخصیت ایک مسلمان کی ہمہ جہتی شخصیت ہے۔ انہوں نے صرف یہی کوشش نہیں کی کہ اسلامی آئیڈیالوجی یعنی وہ اسلامی آئیڈیالوجی جو کبھی زندہ و تابندہ پیکر کی حامل تھی (مگر تاریخ کے طویل ترین ادوار میں سیاسی مکر و فریب یا فلسفیانہ اور معاشرتی تضادات کی طرف جھکاؤ کے رجحان کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اِدھر اُدھر بکھر گئی تھی اور (لوگوں کے گروہ اس زندہ و پائندہ آئیڈیالوجی کی نہیں بلکہ) اس کے کسی ایک ٹکڑے کی حفاظت کر رہے تھے)، ان تمام ٹکڑوں کو جمع کریں، ان کو ترتیب دیں اور ان کی تشکیل جدید کریں۔ اقبال کا شاہ کار صرف یہی نہیں ہے کہ انہوں نے "اسلام میں مذہبی افکار کی تشکیل جدید" نامی کتاب لکھی بلکہ ان کا عظیم ترین شاہ کار یہ ہے کہ انہوں نے اپنی عجیب و غریب، متنوع اور خود ساختہ و پرداختہ شخصیت کو "ایک مسلمان کامل" کی شخصیت بنایا۔

وہ ایک "خود ساختہ"، عظیم اور بیش قیمت شخصیت ہیں۔ اقبال کس طرح اس بات پر قادر ہوئے کہ اسلام نے "انسانیت سازی" کی جو بنیاد مقرر کی ہے، اسی بنیاد پر اپنی شخصیت کی تشکیل کریں؟

ایک روایتی ہندستانی مسلمان زادہ، ایک فرنگی مآب نوجوان جس نے انگلستان میں تعلیم حاصل کی، لندن کی یونیورسٹی سے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی سند لی، ہندستان کا ایک فارسی گو شاعر، ایک نوجوان استعمار مخالف روشن فکر جو خود استعمار زدہ ملک کا باشندہ تھا، ایک انقلابی تشکیل جدید کی بنا پر بیسویں صدی عیسوی میں ایک "مسلمان کامل" اور ایک "علیؑ نما" شخصیت میں تبدیل ہو گیا۔

آخر "علیؑ گونہ" کے معنی کیا ہیں؟

یعنی ایک انسان جس کے اندر وہ تمام انسانی جہتیں اور سمتیں مجتمع ہو جائیں جو عام طور سے کسی ایک فرد میں جمع نہیں ہوتیں۔ اگر ہم اقبال کو صرف ایک استعمار مخالف مسلمان اور ترقی پسند مجاہد آزادی کی حیثیت سے یاد کریں تو یہ ہماری انتہائی سادہ لوحی اور حماقت ہوگی۔

اقبال نے ہندستان کے عہد ماضی کی جس فلسفیانہ اور حکیمانہ بصیرت، یوروپ کے عہد جدید کے فلسفیانہ سرمایے اور یوروپ ہی کے عہد گذشتہ کے جس تعقل کو حاصل کیا تھا، ایک ہندستانی فلسفی ہونے کے ناتے ان کی قومی اور ذاتی فطرت کو جو الہام اور مشرقی روح ملی تھی، ان کو ایران کے اسلامی انقلاب کا جو عمیق، بیش بہا، عالی، حرکت و حرارت سے معمور عرفان حاصل تھا۔ مولانا روم، ان کی مثنوی اور

ان کے دیوان موسوم بہ دیوان شمس تبریز اور عربی ادبیات کے فکر سے معمور سرمایے سے اقبال کو جو عشق، ارادت اور معرفت حاصل تھی، اور پھر اسلامی فلسفہ، اسلامی تاریخ اور اسلامی معارف کے فکری تغیرات و تبدلات کی جو وسیع اور معاشرتی شناخت ان کو تھی۔ خاص طور سے وہ مشق، آزمایش، عمیق اور ہمہ جہتی آشنائی جو اقبال اپنے ایام جوانی ہی سے قرآن پاک سے رکھتے تھے، اور انھوں نے قرآن کی روح اور زبان سے اپنے آپ کو جس طرح آشنا کر لیا تھا، انہی تمام چیزوں کے ذریعہ وہ فلسفۂ خودی کے نام کی جس عمیق جہاں بینی تک پہنچے تھے وہی جہاں بینی ان کے لیے دنیا، انسان اور زندگی کی تفسیر کرتی ہے۔

اس مقام پر اقبال ایک ایسے مسلمان مفکر کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں جو دنیا، آج کی دنیا کی فکر اور ہمارے عہد کے فلسفیانہ افکار کی کورنظری سے بخوبی واقف ہے، اور ہم لوگ جو بقول روشن فکر حضرات "تیسری دنیا" سے تعلق رکھتے ہیں یعنی ان پس ماندہ یا ترقی پذیر معاشروں سے منسلک ہیں جو مادی وسایل کی کمی اور معاشرتی و اقتصادی مشکلات سے پریشان ہیں اور اسی روشن فکری کے نام پر ہم آج کی دنیا میں جو فکری پریشانی، فلسفیانہ مایوسی، بنیادی معتقدات کا تزلزل، تمام اخلاقی و معنوی معیار و اقدار کی شکست و ریخت اور انسان کی علمی اور فلسفیانہ فکر میں جو کور نظری آگئی ہے اس سے شدت کے ساتھ متاثر ہیں۔ اقبال ہم کو اپنے مذہبی اور اسلامی ایمان کی بنیاد پر ان تمام سوالات کا جواب دے سکتے ہیں۔

ہم اسلامی فلسفہ کو اس کی دو قدیم شکلوں یعنی عرفانی اور صوفیانہ شکلوں میں جانتے پہچانتے ہیں یا اس سے بو علی سینا، ابن رشد، غزالی اور مُلّا صدرا کے افکار کے ذریعہ واقف ہیں یا پھر اس کو اس کی روایات کے گنبد بے در میں محصور دیکھتے ہیں ہم جیسے لوگوں کے لیے ایک مسلمان مفکر کی حیثیت سے اقبال کی جہان بینی اور فلسفیانہ رسائی انتہائی عالی، محرمانہ، برجستہ اور حیات و حرکت سے معمور ہے۔

ان باتوں کے علاوہ اقبال ایک اسلام شناس بھی ہیں۔ وہ لوگ جو کہ اسلام کو ایک مذہب کی حیثیت سے جاننے پہچاننے کی ضرورت کا احساس نہیں رکھتے انہوں نے اسلام کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اس کو سمجھے بوجھے بغیر ہی روندا اور ٹھکرایا ہوا قرار دے دیا ہے اور بزعم خود اس بات پر خوش، مطمئن اور مغرور ہیں کہ وہ لوگ روشن فکر بن گئے ہیں۔ ان لوگوں کے علاوہ وہ لوگ بھی جو اسلام کو روایتی، رائج اور محدود قالب میں دیکھتے ہیں وہ اسی روایتی، محدود اور رائج اسلام پر قانع ہیں اور

اپنی ساری توجہ اُسی پر مرکوز رکھتے ہیں ایسے تمام لوگوں کے لیے اسلام شناسی کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

ایسے "روشن فکروں" اور ایسے "مومنوں" ہر دو گروہوں کے لیے اسلام ان باتوں سے عبارت ہے جو یا تو کتابوں میں تحریر ہیں یا منبروں پر بیان کی جاتی ہیں۔ ان دونوں گروہوں میں صرف اس بات کا فرق ہے کہ ان میں سے ایک گروہ کتابوں میں لکھی اور منبروں پر بیان کی جانے والی باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور دوسرا انہی باتوں کا منکر ہے، لیکن وہ لوگ جو اس بات کے پابند ہیں کہ جب تک وہ کسی دلبستان فکر کو دقت نظر کے ساتھ سمجھ نہ لیں اس کے بارے میں کوئی حکم نہ لگائیں وہ لوگ جو خود غور و فکر کرتے ہیں (اور غور و فکر کے بعد ہی) کسی نتیجے پر پہنچتے ہیں وہ اپنے لباس، آرائش، رقص، خانگی ساز و سامان وغیرہ کا انتخاب، "فیشن" "رواج" اور "یوروپی پسند" کی بنا پر نہیں کرتے۔ وہ لوگ جو روشن فکر اور متجدد ہونے کے مدعی نہیں ہیں، وہ لوگ جو یہ نہیں چاہتے کہ موروثی اور توہمات سے معمور مذہب کے حامل بنیں، اسی کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ عشوہ نما، تقلیدی اور نقل کے شایق مذہب مخالف بنیں۔ وہ لوگ جو کہ حقیقی اور اصل معنوں میں روشن فکر ہیں اس بات سے آگاہ ہیں کہ اپنے معاشرے، معاشرے کے عوام، ان کی تہذیب و تمدن تمام سب کی شناخت اور صمیم قلب کے ساتھ اپنی ملت (کی اصل و کنہ) تک رسائی حاصل کرنے کے لیے، دنیا کی متمدن اقوام کو عظمت و بزرگی عطا کرنے والی تاریخ کی شناخت کرنی چاہیے اور دنیا کے عظیم تمدن و تہذیب کو شناخت کرنے کے لیے گذشتہ زمانے کی تاریخ کے ان عناصر تک پہنچنا چاہیے جو اس تہذیب و تمدن کی عظمت و بزرگی کا اصل و حقیقی سبب ہیں اور جن کی بنا پر تہذیب و تمدن کی یہ تحریکیں عالم وجود میں آئی تھیں۔ مزید برآں انسانی زندگی کے ایک عظیم فکری، اخلاقی اور مذہبی مکتب کی شناخت کے لیے اسلام کی معرفت حاصل کرنی چاہیے۔

اقبال جیسے عظیم، آشنا، نو اندیش اور قدر و قیمت کے حامل مفکر کے وسیلے سے دقیق النظری اور علمی طریقے پر اسلام کی معرفت حاصل کرنا ایک معنوی، معاشرتی، علمی، تاریخی اور سیاسی ضرورت ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ خود شناسی بھی ہے کیونکہ ہم خواہ کسی بھی فلسفہ کو مانیں بہر حال ہم اسی مکتب فکر اور اسی تاریخ کے زادہ و پروردہ ہیں اور اسی کی گود میں جوان ہوتے ہیں۔

اقبال اسلامی انقلاب کے ایک مفکر اور مصلح ہیں۔

اگر ہم لوگ (مارٹن) لوتھر اور کالون جیسے مغربی مصلحین کے کاموں کی قدر و قیمت کو پہچان لیں

اور اس مذہبی اصلاحی تحریک کا غائر نظروں سے مطالعہ کریں جس نے اس عیسائی مذہب کو جو گنبد بے در میں محصور، سست روی و انجماد کا شکار اور کلیسائی انحطاط کی گرفت میں تھا، پروٹسٹنٹ ازم کے نام سے نجات دلائی، اور ہم اس بات سے بھی واقف ہوں کہ اس تحریک نے موجودہ دور کے یوروپی تہذیب و تمدن کی پیشرفت و ارتقا میں کیا رول انجام دیا ہے تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ہمارے اونگھتے اور بے حس اسلامی سماج کو سب سے پہلے اسی نوع کے مصلحوں یعنی مسلمان "معترضوں" (PROTESTANTS) کی ضرورت ہے۔

یہ "معترض" مصلحین ایک طرف تو اسلام سے بکمال و خوبی آگاہ و آشنا ہوں اور دوسری طرف وہ اپنے معاشرہ، موجودہ عہد کے مسایل اور ضرورتوں سے بھی آگاہ ہوں اور اس بات سے بھی واقف ہوں کہ ان کو کس اصول پر تکیہ کرنا چاہیے اور کن کن بنیادی باتوں اور کن انحرافوں پر معترض ہونا چاہیے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال جیسے اسلام شناس مصلحوں کے کاموں کی قدر و قیمت اور ان کے بنائے ہوئے نقوش کی عظمت ظاہر ہوتی ہے جو اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ اجتماعی علوم کے بھی عالم ہیں اور جن کے سینوں میں ایک ترقی پسند، ذمہ دار اور استعمار مخالف دل دھڑکتا ہے۔
اسلامی معاشروں کے روشن فکر حضرات کو اس بات سے واقف ہونا چاہیے کہ وہ اپنے معاشرتی کاموں کی انجام دہی میں اقبال جیسے مصلحوں کے افکار کے کس حد تک محتاج و ضرورت مند ہیں۔
اقبال اور ان کے افکار کی شناخت مسلمان عوام کی اجتماعی خود آگاہی اور تہذیبی و تمدنی حرکت و انقلاب میں کس حد تک موثر ہو سکتی ہے۔ اور اسلامی (مسلمان) روشن فکروں کے لیے ان کے افکار کس حد تک قابل تقلید ہو سکتے ہیں؟

اقبال ایک استعمار مخالف رہنما ہیں۔ بعض تاریخی اور معاشرتی حالات میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی (ایک ہی) خاص پہلو، کسی شخصیت جنس، جوہر، فکر یا دبستان خیال کا پورا پورا اور بھرپور تعارف کرا سکتا ہے۔

ایک پس ماندہ یا استعمار زدہ معاشرہ میں استعمار مخالف ہونا صرف سیاسی رجحان طبع ہی کی نشاندہی نہیں کرتا بلکہ کسی فرد کی انسانی شخصیت، شعور و آگاہی کی سطح، اخلاقی صداقت، روحانی تقوی اور اس کے مذہب یا مکتب فکر کی حقیقت و اصلیت کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔
آج کا ایک یوروپی یہ کہہ سکتا ہے کہ میں ایک فلسفی، ادیب، مخترع، انجینیر یا ایک ماہر اقتصادیات

ہوں مگر سیاسی آدمی نہیں ہوں۔ میں سیاسی مسایل پر غور و فکر نہیں کرتا میں نے سیاسی مسایل کے بارے میں سوچ بچار کرنا سیاست دانوں کے لیے چھوڑ رکھا ہے۔

لیکن ایک افریقی، ایک استعمار زدہ ایشیائی یا ایک امریکی ہرگز ہرگز اس طرح کی بات نہیں کہہ سکتا کیونکہ ترقی یافتہ اور نسبتاً فطری طور پر محفوظ معاشروں میں سیاست کا معاشرتی اور فکری سرگرمیوں سے ایک مخصوص نوعیت کا رشتہ ہوتا ہے اور اس بات کی کبھی ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ اس معاشرہ کا ہر فرد خود کو سیاسی مسایل پر سوچ بچار کرنے کا پابند محسوس کرے۔ وہ ایک ادیب، فلسفی، یا ماہر اقتصادیات بن سکتا ہے اور سیاسی کاموں کو سیاست دانوں یعنی ان لوگوں کے سپرد کر سکتا ہے جنہوں نے ان کاموں کے لیے اپنے آپ کو پابند بنالیا ہے، لیکن ایک استعمار زدہ اور پس ماندہ ملک میں سیاست کوئی فرض کفایہ نہیں ہے کہ صرف اس فن کے "ماہرین" ہی اس کے بارے میں سوچ بچار کریں اور اپنے آپ کو سرگرم عمل رکھیں۔

ایسے ملکوں میں سیاست کا کام حکومت کی تشکیل، مملکت کو چلانا اور دوسرے ممالک سے رابطہ قائم رکھنے کے سلسلے میں ملک کے سامنے جو مخصوص مسایل آتے ہیں ان کو حل کرنا نہیں ہے۔ ایسے ملک میں سیاست ایک ایسے واجب کی حیثیت رکھتی ہے جو لازمی اور فوری ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی بھی ہے اور جان بخش و شدید بھی۔ (اس سیاست کا کام) ایک غرق شدہ ملت کو نجات دلانے کے کام میں مصروف ہونا بھی ہے اور آگ میں جھلسی ہوئی ملت کو آتش فشانی سے نجات دلانے کے کام میں مصروف ہونا بھی۔ چہار طرفہ حملوں کے بالمقابل سینہ سپر ہونا بھی ہے اور قید میں گرفتار مجروح، لبِ گور ملت کی نجات کا راستہ تلاش کرنا بھی۔ وہاں (یورپ میں) سیاست ایک آگ بجھانے والی مشین (فائر بریگیڈ) کی سی حیثیت رکھتی ہے جس میں صرف اس فن کے ماہرین ہی مصروف کار رہتے ہیں لیکن پس ماندہ اور استعمار زدہ ممالک میں سیاست کی حیثیت آگ بجھانے والے ایک ایسے عملے کی حیثیت رکھتی ہے جو پوری قوم میں بھڑکی ہوئی آگ کو بجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ ایسے عالم میں یہ بحث و مباحثہ کرنا کہ میں آگ بجھانے والے عملے کا ملازم نہیں ہوں بلکہ فلسفی، مصور، مذہبی رہنما، معلم اخلاق، شاعر، ادیب، مورخ یا انجنیر ہوں بالکل بے معنی ہے۔

پس ماندگی، عام غربت، معاشرتی نابرابری اور بیرونی استعمار جیسے مسایل کسی معاشرہ کے طبیعی، مخصوص اور رائج مسایل نہیں ہیں کہ ان سے صرف چند "ماہرین فن" ہی نپٹیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم کسی ایشیائی، لاطینی امریکی یا افریقی شخص کو روشن فکر، ترقی پسند مفکر، اخلاقی انسان،

ذمہ دار اور پابند عہد فلسفی کہتے ہیں تو ان سب اصطلاحوں سے ہمارا مطلب ہوتا ہے "استعمار مخالف" شخص - خواہ وہ شخص مذہبی ہو یا غیر مذہبی، فلسفی ہو یا کسی فن کا ماہر، ماہر سماجیات ہو یا شاعر۔ ان تمام لوگوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا ہے - جب کسی مسلمان مصلح کی بات کی جاتی ہے تو اس میں یہ خصوصیت (استعمار مخالفت) کامل تر و واضح تر دکھلائی دیتی ہے - تاریخ (کے ہر دور) میں اسلام "عدل و قسط کے قیام کو" تمام برحق دینوں کا ہدف قرار دیتا ہے اور زمین کی حکومت کی باگ ڈور محکوم و مجبور افراد کے ہاتھوں میں دینے کا اعلان کرتا ہے - یہ نکتہ ہمارے لیے سبق آموز اور ہماری غور و فکر کا خاص مستحق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں ہم کسی بھی ایک فرد کو ایسا نہیں دیکھتے جو مسلح مجاہد اور واقعی و عملی نبرد آزما نہ ہو - ہر مسلمان حالات و حادثات کے استثنائی عالم میں نہیں بلکہ اپنی پوری زندگی بھر ایک "طرف دار" مسلح ہوتا ہے۔

فقط اسلام ہی وہ مذہب ہے جو صرف پند و موعظت ہی کا درس نہیں دیتا بلکہ کلمہ کی صداقت کو ظاہر کرنے کے لیے تلوار بھی اٹھاتا ہے۔ اگر لوگ چاہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی مجسمہ بنائیں تو اس کے ایک ہاتھ میں کتاب ہونی چاہیے اور دوسرے ہاتھ میں تلوار - حقیقی و اصلی مسلمان مفت ہی میں سولی پر نہیں چڑھایا جا سکتا۔

ہندستان میں غلام احمد قادیانی نے کوشش کی کہ ایک نئی اسلامی تحریک چلائیں - لیکن وہ ہندستان پر انگریزوں کے تسلط سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے - حتیٰ کہ وہ انگریزوں کی موجودگی کو مسلمانوں کو ہندوؤں کے تعصب سے محفوظ و مامون رکھنے کے لیے مفید سمجھتے تھے - وہ غلام احمد قادیانی عامۃ المسلمین کی نظروں میں نہ صرف یہ کہ رہبر اور اسلامی انقلاب کے مصلح نہ قرار پائے بلکہ ان کو ایک مشکوک بدعتی، منحرف اور خیانت کار کی حیثیت سے جانا پہچانا گیا [1] لیکن چونکہ اقبال ایک خود آگاہ مسلمان اور اسلامی مصلح ہونے کے ساتھ ساتھ استعمار مخالف بھی تھے اس لیے ہندستان کی آزادی اور ایک پاکیزہ معاشرہ کی بنیاد ڈالنے کے لیے ان کی وہ تمام کوششیں جو انہوں نے انگریزوں کی قید سے آزاد ہونے، رجعت پسندی سے چھٹکارا پانے، انحطاط اور خرافات سے رہائی حاصل کرنے کے

---

[1] غلام احمد قادیانی سے عامۃ المسلمین کے اختلاف کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ انگریز دوست تھے عامۃ المسلمین کو ان کے مذہبی افکار سے اختلاف تھا جو آج بھی باقی ہے - معدودے چند افراد کو چھوڑ کر امت مسلمہ کے تمام افراد ان کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ (مترجم)

لیے کیں سب ہی لوگوں کے لیے قابل قبول بنیں - ان کی یہ کوششیں اس حد تک مقبولِ عام ہوئیں کہ بہت سے لوگ ان کو صرف ایک سیاسی شخص، ایک مجاہد آزادی، ایک استعمار مخالف اور جد وجہد آزادی کے میدان کا قومی ہیرو سمجھنے لگے۔

اقبال استعمار کو خواہ وہ کسی شکل میں کیوں نہ ہو اپنے حملوں کا ہدف قرار دیتے تھے۔

اقبال ایک شاعر ہیں شاید اقبال جیسی سنجیدہ و متین اور عظیم شخصیت کے لیے یہ صفت ہلکی معلوم ہو مگر ہر فن کی قدر و قیمت، فن کار کی قدر و قیمت سے جڑی ہوتی ہے۔

وہ عظیم و تعجب خیز روح جو جلال الدین محمد بلخی کے نام سے موسوم ہے، جس کے افکار سے ہماری فضا گونج رہی ہے اور ہماری تاریخ میں جس کے نعرۂ مستانہ کی وجہ سے ایک ہلچل سی مچی ہوئی ہے، ایک شاعر ہی ہے۔

آخر شاعر ہونے کے معنی کیا ہیں؟

یعنی ایک خاص طرح کی بات کہنے کا ہنر رکھنا۔ اسی لیے ہر شاعر کی قدر و قیمت اس بات سے متعین ہوتی ہے کہ وہ کس چیز کی بات کرتا ہے اور کس طرح سے ان باتوں کو جن کو نثر اپنے اندر منتقل کرنے اور ان میں تاثیر پھونکنے سے عاجز و قاصر ہے، کہنے کے لیے اپنے فن کو بروئے کار لاتا ہے۔

اقبال کی مثال ایک ایسے فنکار کی سی ہے جو خود آگاہ بھی ہے اور احساس ذمہ داری کا حامل بھی۔ فن کی ذمہ داری اور اس کے تعہد (COMMITMENT) اور فن کار کی اپنے زمانے اور اس سرزمین سے جبری آگاہی و وابستگی جس میں وہ اپنی زندگی بسر کر رہا ہے اور اسی میں تخلیق فن میں مشغول ہے، کے سلسلے میں آج کل بہت باتیں کی جا رہی ہیں۔ متعہد ادب (-COMMITED LITERATURE) یعنی وہ ادب جس نے اپنے آپ کو جبراً اور لازمی طور پر عوام کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا ہے تاکہ وہ عوام کی اس جنگ میں جو استثمار (ENPLOITATION)، سرمایہ داری اور بورژوازی کے خلاف لڑی جا رہی ہے، عوام کی مدد کرے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کا متعہد ادب بلاشک و شبہ مکمل طور پر طبقاتی نظام اور سرمایہ داری کے خلاف ہے اور ہمیشہ ان مزدوروں کا ہم سفر و ہم گام رہتا ہے جو اپنی آزادی اور نجات کے لیے مصروف پیکار ہیں۔ لیکن تیسری دنیا بالخصوص استعمار زدہ ممالک کا ادب خواہ اور کچھ ہو یا نہ ہو مگر وہ استعمار مخالف ادب ضرور ہوتا ہے۔

کیونکہ وہ بات جس کو کٹر مارکسی حضرات نہیں سمجھ سکتے ہیں یہ ہے کہ ایک استعمار زدہ معاشرہ کی بنیادوں کو نہ تو معاشیات متعین کرتی ہے نہ نظام ملکیت اور نہ نظام پیداوار نہ ہی یہ بنیادیں آلات،

منبوں اور پیداوار کی مختلف جنسوں پر استوار ہوتی ہیں بلکہ ان بنیادوں کو استعمار متعین کرتا ہے ایک استعمار زدہ معاشرہ جس کو مارکسی سماجیات کی بنیادوں پر سمجھنے کی کوشش کی جائے یعنی اس کے تمام اجتماعی مسایل کی توجیہ بطور جزوی مسایل کے یا اقتصادیات کی محکم بنیاد کی طور پر جو اقتصادی پیداوار کے لیے اساس کا کام دیتی ہے، عبث اور بے فائدہ ہے کیونکہ اس طرح کوئی چیز روشن و واضح نہیں ہوتی۔ ایسے معاشرہ میں تمام مسایل اور معاشرہ کی بنیاد اقتصادی پیداوار سے لے کر ثقافت، ادب، سیاست حتیٰ کہ یہ پورا کا پورا معاشرہ جس میں انفرادی، شخصی مذہبی تصورات بھی شامل ہیں ان کو کسی ایک عامل یا بہت سارے نامناسب استعماری عوامل کو سمجھ کر ہی اس معاشرہ کا تحلیل و تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔

اقبال ایک ایسے فن کار اور ذمہ دار شاعر ہیں جن کا تعہد (COMMITMENT) اپنے زمانے اور اپنے معاشرے سے ہے لیکن ان کا یہ تعہد اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ اپنی فکر، احساس اور اپنے فنکارانہ اور ادبی تخلیق کے دامن کی سطح کو چند اوچھی، سیاسی، اخباری اور مبتذل انداز کی حامل سطح تک نیچے اتار لائیں۔ ان کا فن کارانہ تعہد روزمرہ کے سیاسی مسایل تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کا تعہد وسیع عمیق، فکری اور انسانی قدروں کا حامل ہے جس کا ایک لازمی قطعی اور ضروری جزو استعمار مخالف ہونا بھی ہے۔

اقبال افراط اور تفریط کی اُن دو متعصب اور یک چشم بنیادوں کے درمیان جو فرنگی اور ایشیائی معاشروں میں دخیل ہوگئی ہیں۔ ایک تیسری بنیاد ڈالنے کا اعلان کرتے ہیں۔ ان دونوں بنیادوں کے حاملین میں سے ایک بنیاد کے حامل تو ہمارے مرزا ملکم خان اور تقی زادہ کے قول کے مطابق اس بات کے قایل ہیں کہ "ہم سر سے لے کر پیروں کے ناخن تک فرنگی بن جائیں کیونکہ ہم مغرب کے بالمقابل کسی اور راستے کا انتخاب کرنے پر قادر نہیں ہیں۔" (یہ لوگ) بعض باتوں پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کی تکفیر کرتے ہیں۔ (ان لوگوں کے خیال کے مطابق) یوروپی تہذیب و تمدن، فلسفہ و اخلاق، فکر اور ہنر (ART) اور جدید طرز زندگی یہ ساری کی ساری چیزیں ایک دوسرے توام ہیں اور ان سب چیزوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لیے ہم کو ان چیزوں کو پوری کی پوری اور مکمل طور پر قبول کرلینا چاہیے اور ہمارے درمیان جو چیزیں مذکورہ چیزوں کی متخالف و متغایر ہیں ان کو مکمل طور پر اپنے آپ سے دور کردینا چاہیے۔

بہت سے لوگ ایک دوسری ہی انتہا پر چلے گئے ہیں یہ لوگ مغرب سے کسی بھی چیز کو

مستعار لینے کے دشمن ہیں۔ یہاں تک کہ یہ حضرات موٹر کاروں پر سوار ہونے اور اس ڈاکٹر سے مشورۂ علاج کرنے کو بھی نامشروع سمجھتے ہیں جس نے طب جدید میں سند حاصل کی ہے۔ مغربی فکر اور مغرب کے تمدنی وتہذیبی مظاہرہ کو بالکلیہ رد کردینے کا یہ جذبہ چین، ہندستان، جاپان اور بالخصوص یہودی ربیوں میں موجود تھا اور آج بھی موجود ہے۔

اقبال نے سب سے پہلے مشرق ومغرب دونوں کے فکر (THOUGHT) کی تحلیل تجزیہ کیا اور دونوں کے طرز زندگی، تہذیب وتمدن کا موازنہ کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے کہ "مشرق نے حق کو تو دیکھا مگر دنیا کو نہیں دیکھا، مغرب نے دنیا کو دیکھا مگر حق سے گریزاں رہا" اس کے بعد وہ اعلان کرتے ہیں کہ مغربی تہذیب وتمدن کے سامنے سر تسلیم خم کردینا ذلت کا بھی فعل ہے، اور مغرب کی غلامی کا بھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان تمام چیزوں سے دست بردار ہوجانا بھی ہے جو مشرق کے پاس موجود ہیں اور عالم انسانیت ان چیزوں کی احتیاج مند ہے یعنی حق پرستی، ذوق وشوق، ماورائی عشق، (عالم) غیب کی تلاش، فضیلت حاصل کرنے کی تمنا، روح مشرق کا وہ دائمی اضطراب جو تخلیق کا راز جاننے، حقیقت کلی کو سمجھنے اور معمائے ہستی کو جاننے (کے لیے بیتاب ہے)، اور مغرب اور اس کے طرز تمدن سے گریز کرنا، عالم جمود میں آنے، کمزور وناتواں ہونے حتیٰ کہ مغرب کی مطلق العنانیت کے بالمقابل اسیر ہوکر رہ جانے کے مترادف ہے۔

اُن لاادری مفکرین کے خلاف جن کا خیال ہے کہ مغربی علم وصنعت کو اختیار کرنے کے بعد مغرب کے تہذیب وتمدن، اخلاق، معاشرتی روابط اور اس کے طرز زندگی سے کنارہ کش نہیں ہوا جاسکتا اقبال کا کہنا یہ ہے کہ نہ صرف ایسا کیا جاسکتا ہے بلکہ ہم کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔ اس طرح کی کسی دلیل کا کوئی وجود نہیں ہے جو اس بات کو ثابت کرے کہ ایک معاشرہ جو ارفع واعلیٰ عشق، روح کے عرفان، دل کے اشراق، پاک لذتوں سے لطف لینے کے جذبے اور عمیق اخلاقیات وروحانیات سے آشنا ہو، لوہے کے ہل کی جگہ پر ٹریکٹر نہیں چلاسکتا اور اونٹ پر سواری کرنے کے بجائے جٹ طیارہ پر پرواز نہیں کرسکتا اور تیل کا چراغ جلانے کی جگہ پر بجلی کا بلب روشن نہیں کرسکتا۔

اس طرح کا کام نہ صرف یہ کہ ممکن ہے بلکہ عالم بشریت اسی ذمہ داری اور اسی کے مثالی مجموعے سے عبارت ہے۔ بشریت اس وقت کامل واکمل ہوتی ہے جب کوئی شخص دل کی پرواز اور روح کی معراج سے بھی آشنا ہو اور ہوائی جہاز پر بھی پرواز کرے، فضا کا سینہ چیرتا ہوا سیاروں کا سفر کرے۔ ایسا ہی انسان، "انسان" کہلانے کا مستحق ہے اور اس کی فضا میں

پرواز، آسمان کا سینہ چیر دینا، انسانیت کی خوش بختی اور تکمیل کے لیے بہت سے فوائد کی حامل ہوگی۔

اقبال کا پیغام یہ ہے کہ ہم اپنی آگ کو اپنے سینوں میں روشن کیے رہیں اور ایمان، عرفان اور اس عظیم عشق کی روح کو دوبارہ اپنی جانوں میں مشتعل کردیں جو "انسان پرور" ہے تاکہ ہم لوگ ہستی کی روح، جان کے معنی، نیچر کے راز اور وجود کے اصل مقصد پیدائش سے آشنا سے آشناتر ہوجائیں اور جب ہم کو یوروپ کی طرح سے طاقت و قوت حاصل ہو، مادی اور صنعتی منفعت حاصل کرنے میں کامیابی ہو تو ہم لوگ یوروپ کی طرح ایمان کی گمراہی، خیال کی پراگندگی اور فکر کی تیرگی سے دوچار نہ ہوں۔ اپنی زندگیوں میں مذہب کو اس طرح مضبوط کرلیں کہ اُسی کی قدرت و طاقت کے ذریعے ہم اپنے آپ پر قابو حاصل کرسکیں اور غیر انسانی میلانات، پست قسم کی لایق تعزیر ہوسوں، لالچ، خوف و خطر، روح کی ناتوانی اور اپنی عادتوں کی غلامی سے نجات حاصل کرکے آزاد ہوسکیں۔ مزید برآں ہم مغرب کا علم، ترقی یافتہ ٹکنالوجی اور اس زندگی کی منطق کو اختیار کریں تاکہ دنیا ہمارے زیرنگیں آجائے اور ہم نیچر کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنالیں۔ مذکورہ بالا دونوں باتوں کی مدد لے کر ہم اپنی ناتوانی و کم مائگی اور نیچر کے جابر و قاہر عوامل پر فتح حاصل کرلیں اور اپنی مادی خواہشوں کی خودمختاری کے ذریعے جو جدید علم و تکنیک کے ذریعے ممکن ہے، ہم اپنی معنوی تکمیل، تلاش حقیقت، نوع انسانی کی پیشرفت کے راستے میں سبکسارانہ سرگرم سفر رہیں۔

جاپان کا تجربہ اگرچہ اقبال کے آئیڈیل کا کامل نمونہ نہیں قرار دیا جاسکتا ہے تاہم ان نام نہاد روشن فکروں کے اس خیال کی تردید کے لیے جو یہ کہتے ہیں کہ "یہ ممکن نہیں ہے کہ یوروپ کا علم و صنعت اختیار کرلیا جائے اور اپنا ملی اور تہذیبی تشخص برقرار رکھا جائے"، ایک زندہ و تابندہ اور حال ہی کے زمانے کی مثال ہے۔

وہ قوم جس نے صنعت کے میدان میں ربع صدی کے مختصر عرصے میں یوروپ کے جدید ترین صنعتی ممالک کے مقابلے میں پیشرفت کی ہے وہ اس فرنگی مآبی کی گرد تک بھی ایک ہزار سال تک نہ پہنچ سکے گی جو تہرانیوں کا شیوہ ہے یا جس کے اسیر ہمارے ملک کے دوسرے متجدد روشن فکر شہری حضرات ہوچکے ہیں۔ آپ جاپانی عورت پر نگاہ ڈالیے۔ وہ خود اپنی بنائی ہوئی جدید ترین ڈی لکس موٹر کار پر چلتی ہے اور اپنے ہی بنائے ہوتے عہدِ حاضر کے جدید ترین وسائل زندگی کے ذریعے اپنی زندگی گزارتی ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اپنی قدیمی، ملی اور نسوانی خصوصیات کے ساتھ اُسی

قدیم جاپانی لباس و آرائش میں اپنی زندگی گذارتی ہے اور اس بات سے واقف نہیں ہے کہ عصر حاضر کا (یوروپی) لباس کس طرح پہنا جاتا ہے۔

اب ذرا ایرانی یا افریقی عورت پر نظر ڈالیے جس کے پاس اس جدید اور متمدن دنیا کی کوئی اور چیز نہیں ہے جو کچھ ہے وہ لے دے کر مجلّہ "لوردا" ہے جس تک اس کی دسترس ہے مگر اس کے باوجود وہ اس قدر جدید اور آزاد ہوگئی ہے کہ اس کا دل سولیس عورت کی پس ماندگی پر آنسو بہاتا رہتا ہے۔

یہی حال ہمارے متجدد مرد حضرات کا بھی ہے اُدھر تو امریکی فضا میں اپالو بھیج رہا ہے اور خدا جانے کیوں یہاں یہ حضرات اس طرح چاہ غبغب میں ہوا بھر رہے ہیں (گویا کہ یہ انہی کا کارنامہ ہے) اور ان کا کوئی حریف و مدمقابل نہیں ہے۔

اقبال کی خواہش تھی کہ پاکستان بیسویں صدی عیسوی میں اسلام کا ایک عظیم اور نیا تجربہ بنے۔ یہ ایسا ہندستان ہو جس نے اس مغربی تمدن کو اپنی بنیاد بنا رکھا ہو جس نے ہندستانی تمدن (کی روح) کو اپنے پر زور و پُر طاقت جسم میں جلوہ گر کر رکھا ہو۔ ایسا ہی معاشرہ اسلام کا پسندیدہ معاشرہ ہے۔ چونکہ اقبال خود بھی ایسے ہی انسان تھے، ان کا دل مشرقی تھا اور دماغ مغربی یعنی ایک خودشناس اور تشکیل جدید پائے ہوئے مسلمان۔

یہ صرف مسلمانوں یا مشرق ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ عالم بشریت کی احتیاج و ضرورت ہے۔ وہ عالم بشریت جس کا نصف حصہ مشرق میں پلا، بڑھا اور ارتقا پذیر ہوا ہے اور نصف حصہ مغرب میں۔ یہ دونوں کے دونوں حصے "کامل بشریت" کا ایک "ناقص نمونہ" ہیں۔ عالم بشریت اس پرندے کے مانند ہے جس کا ایک بازو مشرق میں اور دوسرا بازو مغرب میں ٹوٹ کر گر پڑا ہے۔ ہر چند کہ یہ دونوں بازو ایک دوسرے سے جُدا ہو کر ارتقا پذیر بھی ہیں اور طاقت و قوت بھی پا رہے ہیں لیکن (ان کے اس ارتقا اور طاقت و قوت کے باوجود) یہ پرندہ زمین سے اوپر نہ اُٹھ سکے گا۔

اس پر شکستہ اور زمین پر پڑے ہوئے پرندے کے دونوں بازوؤں کو ان کی جگہوں پر جوڑنے کی کوشش کا نام اسلام ہے۔ یہ کوشش اس لیے ہے کہ یہ دونوں بازو ایک دوسرے کے ہم آہنگ اور ہم انداز ہو کر ارتقا کی راہ پر گامزن ہوں، لیکن افسوس یہ ہے کہ اسلام کی قسمت خود ہی اس پرندے کی قسمت سے دوچار ہوگئی ہے۔ اقبال کی کوشش یہ ہے کہ وہ اس کی تشکیل جدید

کریں۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال اور ان کے جیسے تمام خود شناس مسلمان مفکروں کی مصلحانہ کوششیں کسی ایک مذہب یا کسی ملت کے گنبدِ بے در میں محصور ہو کر نہیں رہ جاتیں بلکہ ان کی یہ کوشش عالم البشریت کی تشکیل جدید، ایک نئے تمدن کی بنیاد ڈالنے اور ایک نئی نسل انسانی کو عالم وجود میں لانے سے عبارت ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کی قانون فطرت کو آرزو ہوتی ہے۔

سید جمال الدین کے بعد اقبال ایک ایسے عبقری مفکر ہیں جنہوں نے "اپنی اصل کی طرف مراجعت" کی تحریک کو اس امت میں جاری و ساری رکھا جو خلیج فارس سے لے کر شمالی افریقہ اور چین تک پھیلی ہوئی ہے۔ اپنی اصل کی طرف مراجعت کی یہ تحریک، اس تحریک کی طرح نہیں ہے جو ان آخری ایام میں ہمارے یہاں در آئی تھی اور "غرب زدگی" کے بعد ہم خوش خوش "شرق زدگی" اور "خود زدگی" کے گھناؤنے اور جاہلی دور کی طرف دوبارہ واپس آ گئے ہیں۔ مقامی اور بدوی رسم و روایات کو زندہ کرنا اور ان کا مظاہرہ کرنا اور ان قومی خرافات اور روایات کی طرف واپس لوٹنا جو انحرافی روایات ہونے کے ساتھ ساتھ "پتھر کے عہد کے انسان" کی یاد دلاتی ہیں اور پس ماندگی کی بھی علامت ہیں اپنی اصل کی طرف واپس جانا نہیں ہے۔ ہاں، لنگوٹی لگانا اور ملاقات کے کمرے میں گھوڑے کا زین اور توبڑہ آویزاں کرنا، یا گدھے کا مہرہ لٹکانا بھی اپنی روایات کی طرف مراجعت یا اپنے قومی اور لوک تمدن کا احیا نہیں ہے۔ یہ تمام کی تمام باتیں بھی متمدن انگریزوں اور امریکیوں کی گھناؤنی نقلیں ہیں۔

اپنی اصل کی طرف مراجعت کے معنی ہیں اپنی شرف و منزلت کی حامل انسانی خصوصیات کی طرف واپس آنا اور ان فکری اور تمدنی اقدار کا احیاء کرنا جو ہم کو آگاہی بخشنے اور ترقی کی راہ پر گامزن کرنے والی ہوں۔

اپنی اصل کی طرف مراجعت اس طرح نہیں ہوتی کہ غرب زدگی کی مخالفت بطور فیشن رائج ہو جانے کے بعد خود غرب زدہ افراد نے بھی اس کو بطور فیشن اپنا لیا ہے مگر اس بات سے وہ خود بھی واقف نہیں ہیں کہ ماڈرن ہو جانا، اس کا مظاہرہ کرنا، فرنگی کو گالیاں دینا اور قدیم و فرسودہ رجعت پسندانہ آداب و رسوم کی طرف واپس لوٹ جانا اپنی اصل کی طرف مراجعت نہیں ہے۔

اپنی اصل کی طرف مراجعت کی یہ تحریک ایک عمیق، دشوار اور خود شناسی و خود سازی کی حامل تحریک ہے۔ جس کا لازمہ یوروپی تہذیب و تمدن اور آج کی دنیا کی تمام خوبیوں اور خامیوں کو جاننا

پہچاننا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیب و تمدن، ادب، مذہب اور انسانی شرف و منزلت کو بھی جاننا پہچاننا اس تحریک کا لازمہ ہے اور یہ بھی جاننا پہچاننا ہے کہ وہ کون سے عوامل ہیں جو ہمارے معاشرے اور تمدن کو انحطاط پذیر کرتے ہیں اور کون سے عوامل اس کو ارتقا کی راہ پر گامزن کرتے ہیں۔ عوام سے باہمی سمجھوتا اور معاشرہ سے تجانس (HOMEGENEITY) بھی اس تحریک کا ایک لازمہ ہے۔ سب سے آخری لازمہ اس تحریک کا یہ ہے کہ زمانۂ انحطاط نے ہمارے درمیان جو کچھ اگایا تھا اور جس کو استعمار نے ہم سے چھین کر یا تو منسوخ کر دیا۔ یا اس کی شکل و صورت بدل ڈالی ہے، اس کا احیا کیا جائے۔ یہ کوئی ایسا کام نہیں ہے کہ امرسنرز اور فینن کے ایک دو انٹرویو کا ترجمہ کر کے یا انہی کے نقال ان ایرانی مصنفوں کے چند مقالوں سے جو اپنی اصل کی طرف مراجعت کی بات کرتے ہیں، انجام دیا جا سکتا ہے، اپنی اصل کی طرف مراجعت کس طرح کی جا سکتی ہے؟ یہ مراجعت اسی طرح کی جا سکتی ہے جس طرح اقبال نے کی ہے۔ اقبال یوروپ گئے اور ان کا شمار موجودہ عہد کے ایک فکر انگیز فلسفی کی حیثیت سے ہونے لگا۔ انہوں نے یوروپ کی تہذیب و تمدن اور اس کے معاشرے کو غائر اور محرمانہ نظروں سے دیکھا اور اس کے بعد وہ اسلام کی طرف راجع ہوئے اور محنت و مشقت، غور و فکر، تعلیم، نبرد پیہم، مطالعۂ اسلام، قرآن فہمی، عرفان، عوام اور اسلامی حکومتوں کی سرنوشت (سے آگاہی)، ہندستان کے معاشرے اور عالمگیر استعمار کے ذریعے انھوں نے اپنے آپ کو پہچانا اور عملی طور سے سیاسی، ادبی، فلسفیانہ، جہد آزادی، انصاف طلبی اور استعمار مخالفت کی تحریک میں شریک رہے اور اس طرح آخر کار "خودشناسی" اور "خودسازی" کے ساتھ وہ اپنی اصل کی طرف واپس آئے۔ تمام دنیا جہان اور ماضی و حال کی سیر کرنے کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو ایک ترقی پسند مسلمان، مفکر، آزادی خواہ، مشرقی، فلسفی، مجاہد، فن کار اور اسلامی ادیب بنایا۔ اپنی اصل کی طرف مراجعت یہی ہے۔

بیسویں صدی عیسوی میں جینا یہی ہے۔ ایک پس ماندہ اور استعمار زدہ مشرقی اسلامی معاشرہ میں روشن فکر ہونا یہی ہے۔

آج کے ہمارے عہد کے فلسفہ کی اس کور نظری، بے حقیقتی، عبث فکری، اور پراگندہ خیالی کے درمیان ایک مکتب فکر کا حامل ہونا اور اپنے عقائد کی بنیادوں پر "جہاں بینی" کو استوار رکھنا اور اس کو شرف و منزلت کا حامل بنانا، یہی ہے۔

"علی گونہ" ہونا یہی ہے ۔ ۔ ۔ اور آخر الامر محمد اقبال یہی ہیں۔ ہر معیار و پیمانے سے ایک

کامل ومکمل مسلمان اور ہمارے عہد میں "فکر اسلامی کی تشکیلِ جدید" کے معمار۔

میں قوم پرستی کے مرض میں مبتلا نہیں ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ ایرانی فکر نے تاریخ اسلام کے سخت ترین سیاسی ادوار میں بھی اس بات کا مظاہرہ کیا کہ اس نے حقیقت اسلام کو اس رخ سے نہیں جس رُخ سے اس کے سامنے پیش کی گئی تھی بلکہ اُس رُخ سے جس کو کہ اس سے اس لیے چھپایا گیا تھا کہ وہ تاریخ کو فراموش کر دے، پایا ہے۔ ایرانیوں نے آغاز اسلام کے زمانے ہی سے بنی امیہ اور بنی عباس کی تبلیغات کے علی الرغم اُس حق کو جو کہ پائمال ہو چکا تھا اور اس راہ کو جو کہ اسلام کی اولین راہ تھی شناخت کیا اور ایرانی عبقریت دوسری، تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں جو کہ اسلامی تمدن کا عہد زرین تھا سب سے بڑی بلکہ شاید عبدالرحمٰن بدوی کے قول کے مطابق وہ تنہا عامل تھی جس نے اسلامی تعلیمات، اس کی روح اور اسلامی تمدن کی معنویت کو پھیلایا[۱]۔ لطف کی بات یہ ہے کہ آج کی اسلام کی نشاۃ ثانیہ، روح (اسلام) کا احیا، فکر اسلامی اور خواب خرگوش میں مبتلا مسلمان معاشروں کی حرکت وبیداری کا سب سے پہلا مبلغ وممتاز سید جمال الدین اسد آبادی ہم ہی میں سے ایک تھا اور ان کی تحریک کو برقرار رکھنے والا اقبال بھی ہم ایرانیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:

چون چراغ لاله سوزم در خیابان شما + ای جوانان عجم جان من وجان شما
حلقه بر گردم زنید ای پیکران آب وگل + آتشی در سینه دارم از نیاکان شما

میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ ملی فخر وغرور اور قومی رجز خوانی کے تحت نہیں عرض کیا ہے میں نے یہ باتیں اس لیے عرض کی ہیں کہ ہمارے معاشرہ کے خود شناس اور دردمند روشن فکر حضرات اپنی ذمہ داریوں کو پہچانیں اور اس کام کی اہمیت کو محسوس کریں۔

---

[۱] اس دورِ آخر کے یہ "ملی" علما اور محققین جو اسلام کی تضعیف کے بارے میں یہ فرماتے ہیں کہ ایرانیوں نے جزیہ سے راہ فرار اختیار کرنے کے لیے ظاہراً اسلام قبول کیا۔ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ تاریخ کی کسی چیز سے واقف نہیں ہیں بلکہ اس کا شعور بھی نہیں رکھتے کہ یہ جان سکیں کہ کوئی بھی مذہب ٹیکس کے ذریعے نہیں پھیلتا (یہ بات کہہ کر یہ لوگ) ایک ملت کی سخت توہین کرتے ہیں۔ اُس ملت کی جس نے اپنے عقیدے کی حفاظت کے لیے اپنا خون بہایا ہے۔ حتیٰ کہ یہ حضرات اس بات کا بھی اتہام لگاتے ہیں کہ قبل از اسلام کی مزدکی تحریک کے زمانے میں بھی ایرانیوں نے جزیہ سے بچنے کے لیے اپنے عقیدہ کو خیرباد کہہ دیا تھا، ان محققوں کے آباء واجداد ٹیکس وصول کرنے والے لوگ تھے ملت ایران نہ تھی۔ (متن مطابق چاپ ہند)

نسیم باغ سری نگر
شب یک شنبہ
۲ مئی ۱۹۸۱ء

○ × ○ × ○